معارف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

صدائے ثقلین

لندن

مجمع اہل بیتؑ برطانیہ

جنوری تا مارچ 2015ء 23 جلد 6 شمارہ 3

نظارت

حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی

مدیر

جعفر علی نجم

مجلس تحریر

حجۃ الاسلام مولانا محمد حسن معروفی (لندن)

حجۃ الاسلام مولانا سید علی رضا رضوی (لندن)

حجۃ الاسلام مولانا سید فدا حسین بخاری (مانچسٹر)

حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل (مانچسٹر)

ادارہ کا مقالہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

خط و کتابت کیلئے

Ahlul Bayt Assembly of UK ®

In Association with

Islamic Center of England

140 Maida Vale, London, W9 1QB, UK

Web: www.ic-el.com

Email: saqalainurdu@live.co.uk

فہرست

مضامین	مقالہ نگار	صفحہ
سخن مدیر	جعفر علی ہتھم	3
انتہا پسندی کے بارے میں عالمی کانفرنس سے رہبر معظم کا خطاب	حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای مدظلہ	5
دُعائے کمیل پر ایک نظر	حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی	16
شیعہ اسلامی عقائد	علامہ سیّد محمد حسین طباطبائیؒ	31
ایمان و کفر	حجۃ الاسلام مولانا سیّد فدا حسین بخاری	47
اخلاق نبوی کی رفعتیں	حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل	57
ولی عہدی امام رضا علیہ السلام کا مسئلہ	استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہریؒ	68
حضرت امام حسن عسکریؑ	آیت اللہ شیخ محمد جواد لنکرانی	86
حیاتِ پیغمبر اکرمؐ کے چند نمایاں پہلو	مجمع التقریب	96
خصائص علوم اہل بیتؑ	آیت اللہ محمد محمدی ری شہری	106
شرحِ چہل حدیث	آیت اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ	118
مدحِ حضرت امام جعفر صادقؑ	علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ	127

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن مدیر

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
(علامہ اقبالؒ)

الحمدللہ، سہ ماہی ثقلین کا ایک اور شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اس شمارہ سے یہ مجلہ چھپے گا نہیں بلکہ دنیا بھر میں آنلائن علم دوست لوگ اس سے استفادہ کرسکیں گے۔ یقیناً چھپی ہوئی کتاب، رسالے یا اخبار کی ابھی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے اور جو قارئین کرام فقط چھپے ہوئے مواد کے پڑھنے کے عادی ہیں وہ اس رسالے کو ضرور MISS کریں گے۔ لیکن جس تیز رفتاری کے ساتھ دنیا بھر میں انٹرنیٹ کا استعمال بڑھ چکا ہے اور اس وقت کافی تعداد میں ایسے ویب سائٹس بھی موجود ہیں کہ جن پر آج کے جدید سائنسی دور میں جا کر کافی مواد پڑھا جاسکتا ہے۔

قارئین کرام! آنلائن رسالوں کی کوئی کمی تو نہیں ہے، مگر اس رسالے کی نہایت محدود تعداد میں اشاعت کی بجائے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اسے ویب سائٹ کے ذریعہ دنیا بھر کے قارئین کی خدمت میں پہنچایا جائے۔

ماشاء اللہ ماہ محرم وصفر میں دنیا بھر میں جس انداز سے مومنین کرام نے عزاداری کا اہتمام کیا، نہایت ہی قابل ستائش ہے۔ امام خمینیؒ کے بقول یہ محرم وصفر ہی ہیں کہ جن کی وجہ سے آج اسلام زندہ اور باقی ہے۔ درحقیقت یہ عزاداری تشیع کی طاقت کا سرچشمہ ہے کہ آج جس کا سب اقرار کررہے ہیں۔

خاص طور پر اس سال چہلم امام حسین علیہ السلام کے موقع کربلا کی مقدس سرزمین پر دو کروڑ سے زائد عاشقانِ حسینی کا جم غفیر اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ دنیا بھر سے لبیک یا حسینؑ کہنے کیلئے عاشقان حسینی موجود ہیں۔ افسوسناک پہلو یہ ہے دنیا کے اس عظیم ترین انسانی اجتماع کو عالمی میڈیا نے کوریج نہیں دی، لیکن پیغام حسینی دنیا بھر میں پھر بھی نشر ہوا اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ تا قیام قیامت باقی رہے گا۔

علاوہ ازیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے موقع پر اس وقت دنیا بھر میں ہفتہ وحدت منایا جارہا ہے کہ جو اس دور میں سب مسلمانوں کیلئے وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں کی زبوں حالی اور عقب ماندگی کا علاج فقط اور فقط اتحاد اور اتفاق میں مضمر ہے۔ آج بھی مسلمان ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قرآن کریم اور سیرت محمد وآل محمد علیہم السلام پر عمل پیرا ہوں تو ان کی عظمت رفتہ واپس آسکتی ہے۔

آخر میں ہم اپنے تمام قارئین کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جو رسالہ ''صدائے ثقلین'' کے بارے میں حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں اور خاص طور پر ان تمام قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں کہ جن تک یہ رسالہ اب اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ پائے گا۔ امید ہے کہ آپ سب اپنی دُعاؤں میں ہمیں فراموش نہیں کریں گے۔

اسی طرح ہم جناب مولانا سیّد ریاض حسین صفوی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے ہمیشہ کی طرح کاوش اور جانفشانی سے سہ ماہی صدائے ثقلین کی تدوین وطباعت میں مدد فرمائی ہے۔

ہمیں قارئین محترم اور علمائے کرام اور خاص طور پر آنلائن قارئین کرام کے مفید اور قیمتی مشوروں نیز آراء وتجاویز کا انتظار رہے گا۔ شکریہ!

والسلام

جعفر علی نجم

(29 دسمبر 2014ء)

☆☆☆☆☆

انتہا پسند تکفیریوں کے بارے میں عالمی کانفرنس میں شریک علمائے کرام سے رہبر معظم حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای مدظلہ العالی کا خطاب[1]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ نَبِیِّنَا الْمُصْطَفَی الْاَمِیْنَ مُحَمَّدٍ وَ اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَ عَلٰی صَحْبِہِ الْمُنْتَجَبِیْنَ وَ التَّابِعِیْنَ لَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

میں سب سے پہلے اس کانفرنس میں شریک معزز مہمانوں، حاضرین محترم اور مختلف اسلامی مسالک کے علمائے کرام کو خوش آمدید کہتا ہوں اور انتہائی اہمیت کی حامل اس دوروزہ کانفرنس میں آپ کی فعال، سرگرم اور مؤثر شرکت پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ میں قم المقدسہ کے بزرگ علماء وفضلاء بالخصوص آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی اور آیت اللہ جعفر سبحانی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے یہ نئی فکر پیش کی اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ بحمد اللہ انہوں نے اس مہم کا پہلا قدم اٹھایا اور اس سلسلے کو آگے بھی جاری رہنا چاہیے۔ گزشتہ دو دنوں کے دوران مقررین کی تقاریر سے اجمالی طور پر میں مطلع ہوا۔ میں بھی اس سلسلے میں چند نکات پیش کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اجلاس تکفیری تحریک کے بارے میں بحث کیلئے منعقد ہوا ہے جو عالم اسلام کے اندر بڑی خطرناک اور نقصان دہ تحریک کے طور پر فعال ہے۔ تکفیری تحریک ویسے تو کوئی نئی تحریک نہیں ہے، اس کا تاریخی ماضی ہے، لیکن گزشتہ چند سال سے استکبار کی سازشوں، علاقے کی بعض حکومتوں کی ثروت و دولت اور امریکہ، برطانیہ اور صیہونی حکومت جیسی استعماری طاقتوں کی خفیہ ایجنسیوں کی

---

[1] یہ خطاب 25 نومبر 2014ء کو تہران میں کیا گیا۔ (بشکریہ از: www.leader.ir)

منصوبہ بندی کے نتیجے میں اس تحریک کا احیاء عمل میں آیا ہے اور اسے تقویت پہنچی ہے۔ یہ اجلاس، یہ کانفرنس اور آپ کی یہ کوشش، اس تحریک کا ہمہ جہتی مقابلہ کرنے کیلئے اہم قدم ہے۔ صرف اس گروہ کا مقابلہ کرنے کیلئے نہیں جو آج ''داعش'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج داعش کے نام سے جس گروہ نے اپنی شناخت بنائی ہے وہ تکفیری فکر کے ''شجرہ خبیثہ'' کی ایک شاخ ہے۔ یہ مکمل درخت نہیں ہے۔ اس گروہ نے جو فتنہ برپا کیا ہے کہ کھیتیوں اور نسلوں کو تباہ و برباد[1] اور بے گناہوں کا خون بہا رہے ہیں، یہ عالم اسلام میں اس تکفیری تحریک کے وحشیانہ اور ہولناک جرائم کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ بنابریں اس مسئلے کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لینا چاہیے۔

آج عالم اسلام کی سطح پر ہماری طاقت وتوانائی صیہونی حکومت کی سازشوں کا مقابلہ کرنے پر صرف ہونی چاہیے تھی، صہیونیوں نے بیت المقدس اور مسجد الاقصیٰ کے خلاف جو قدم اٹھایا ہے، اس سے پورے عالم اسلام کو حرکت میں آجانا چاہیے تھا، لیکن مجھے دلی افسوس ہے کہ ہم تکفیریوں کی پیدا کردہ مشکلات میں پھنس گئے ہیں جو سامراجی طاقتوں نے تکفیریوں کے ذریعہ عالم اسلام کے اندر پیدا کر دی ہیں۔ ہمارے پاس اس مسئلہ پر بحث کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ درحقیقت تکفیری فکر کے مسئلے کا علاج ایسا معاملہ ہے جو عالم اسلام کے علمائے کرام، اسلامی دنیا کی نمایاں شخصیتوں اور ممتاز دانشوروں پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ دشمن نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ان کٹھ پتلیوں کو عالم اسلام پر مسلط کر دیا ہے۔ اس لئے ہم اس مشکل کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں، جبکہ اصلی مسئلہ، صیہونی حکومت کا مسئلہ اور فلسطین کا ہے۔ اصلی مسئلہ بیت المقدس کا مسئلہ ہے۔ اصلی معاملہ مسلمانوں کے قبلہ اوّل بیت المقدس کا ہے۔ ہمارے اصلی مسائل یہ ہیں۔

ایک ناقابل انکار نکتہ یہ ہے کہ تکفیری تحریک اور اس کی پشت پناہی کرنے والی حکومتیں پوری طرح عالمی سامراج اور صیہونیوں کے عزائم و مقاصد کے دائرے میں رہتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔

---

[1] یہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۰۵ کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾: ''اور جب آپؐ کے پاس سے پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں فساد برپا کرنے اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرنے میں کوشاں رہتا ہے، جبکہ خدا فساد کو پسند نہیں کرتا ہے''۔

ان کے اقدامات امریکہ، یورپ کی استعماری حکومتوں اور غاصب صیہونی حکومت کے اہداف کے تناظر میں انجام پا رہے ہیں۔ موجودہ شواہد سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ تکفیری تحریک کا ظاہر تو اسلامی ہے لیکن وہ عملی طور پر ان سیاسی استعماری و استکباری طاقتوں اور حلقوں کی خدمت کر رہی ہے جو عالم اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ اس بات کے واضح ثبوت موجود ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان میں سے بعض شواہد کا ذکر کروں گا:

ایک ثبوت تو یہ ہے کہ تکفیری تحریک نے اسلامی بیداری کی لہر کا رخ موڑ دیا ہے۔ اسلامی بیداری کی لہر امریکہ مخالف، داخلی استبداد کے خلاف اور علاقے میں امریکہ کے آلہ کار حکمرانوں کے خلاف اٹھنے والی لہر تھی۔ یہ لہر عوامی لہر تھی جو شمالی افریقہ کے ملکوں میں سامراج کے خلاف اور امریکہ کے خلاف اٹھی تھی، لیکن تکفیری تحریک نے امریکہ مخالف، استبداد مخالف اور استکبار مخالف اس عظیم لہر کا رخ مسلمانوں کے درمیان آپس کی جنگ اور برادر کشی کی جانب موڑ دیا۔ اس علاقے میں جدوجہد کا اگلا محاذ مقبوضہ فلسطین کی سرحدیں تھیں۔ تکفیری تحریک نے اس فرنٹ لائن کی جگہ بدل کر اسے شام اور دمشق کی جامع مساجد، بغداد کی سڑکوں، پاکستان کی سڑکوں اور شام کے مختلف شہروں میں پہنچا دیا۔ اب اسلامی ممالک کی یہ جگہیں فرنٹ لائن میں تبدیل ہوگئی ہیں۔

آپ آج لیبیا کی صورتحال مشاہدہ کیجئے، شام کی صورتحال کا جائزہ لیجئے، عراق کے حالات کو دیکھ لیجئے اور پاکستان کی صورت حال کو دیکھئے۔ غور کیجئے کہ مسلمانوں کی توانائیاں اور تلواریں کس کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں؟ مسلمانوں کی یہ توانائیاں صہیونی حکومت کے خلاف استعمال ہونی چاہئیں تھیں۔ تکفیری تحریک نے اس مقابلہ آرائی کا رخ ہی موڑ دیا اور اسے گھروں کے اندر، ہمارے شہروں کے اندر اور اسلامی ممالک کے اندر پہنچا دیا۔ دمشق کی جامع مسجد کے اندر دھماکہ کرتے ہیں۔ بغداد میں عام شہریوں کے اجتماع میں دھماکہ کرتے ہیں، پاکستان میں سینکڑوں لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیبیا میں وہ حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ جن کا آپ آج خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ سب تکفیری تحریک کی کبھی فراموش نہ کی جانے والی مجرمانہ حرکات اور کارروائیاں ہیں۔ یہ حالات کس نے پیدا کئے ہیں۔

اس تکفیری مکتب فکر کی طرف سے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں وہ درحقیقت امریکہ کی خدمت ہے، برطانیہ کی مدد ہے، ایسے اقدامات ہیں جن سے امریکہ اور برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں اور موساد کی مدد ہو رہی ہے۔

ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جو لوگ تکفیری مکتب فکر کے حامی اور اس کے طرفدار ہیں، وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کیلئے صیہونی حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔ صیہونی حکومت کے معاملے میں ان کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑتا، لیکن اسلامی ملکوں کے معاملے میں، مسلم اقوام کے سلسلے میں، گوناگوں بہانوں سے، مختلف طرح کی سازشیں کرتے ہیں اور ضربیں و چوٹیں وارد کرتے ہیں۔

ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس تکفیری تحریک نے اسلامی ملکوں میں، عراق میں، شام میں، لیبیا میں، لبنان میں، بعض دیگر اسلامی ممالک میں جو فتنہ انگیز مہم چلائی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ملکوں کی گراں قیمت بنیادی تنصیبات تباہ ہو کر رہ گئیں۔ آپ مشاہدہ کیجئے کہ کتنی سڑکیں، کتنی ریفائنریاں، کتنی معدنیات، کتنے ایئرپورٹ، کتنی شاہراہیں، کتنے شہر، کتنے گھر، ان ملکوں میں داخلی جنگوں کی وجہ سے اور اس برادر کشی کے نتیجے میں تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ ان تباہ شدہ جگہوں کو دوبارہ اسی حالت پر لوٹانے میں کتنا سرمایہ، کتنا وقت اور کتنے وسائل درکار ہوں گے۔ یہ وہ خسارہ ہے جو ان چند برسوں کے دوران تکفیری تحریک نے عالم اسلام کو پہنچایا ہے۔

ایک اور ثبوت یہ ہے کہ تکفیری تحریک نے دنیا میں اسلام کی شکل و صورت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ ساری دنیا نے ٹیلی ویژن چینلوں پر دیکھا کہ کسی شخص کو بٹھاتے ہیں اور پھر تلوار سے اس کی گردن کاٹ دیتے ہیں، جرم ثابت ہوئے بغیر اس کا گلا کاٹ دیتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ﴾

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے اور انصاف سے پیش آنے سے نہیں روکتا جنہوں نے دین کے معاملات میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے دیار سے بے دخل نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے بے دخل کر دیا ہے اور اس عمل میں جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔۔[1]

مگر یہ لوگ اس کے بالکل برخلاف عمل کر رہے ہیں۔ مسلمان کو قتل کیا، نہتے اور معصوم غیر مسلم کو تلوار کے نیچے بٹھایا اور پھر اس کی تصویر ساری دنیا میں نشر کر دی اور ساری دنیا نے اسے دیکھا۔ پوری دنیا نے دیکھا کہ ایک شخص نے اسلام کے نام پر ایک شخص کو قتل کیا اور اس کے سینے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کا دل باہر نکالا اور دانتوں سے چبا ڈالا۔ اسے دنیا نے دیکھا اور یہ سب اسلام کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ رحمت والے دین اسلام کو، عقل پسندی کے دین اسلام کو، منطقی دین اسلام کو ﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ کا سبق دینے والے اسلام کو، اس اسلام کو ان لوگوں نے اس انداز سے پیش کیا، اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟! اس سے زیادہ نفرت انگیز فتنہ کیا ہو سکتا ہے؟ اسلام کو بدنام کرنے کیلئے یہ تکفیری تحریک کا کارنامہ ہے۔

ایک اور ثبوت یہ ہے کہ تکفیریوں نے اسلامی مزاحمتی محاذ کو اس کے حال پر اکیلا ہی چھوڑ دیا۔ غزہ پچاس دن تک اکیلا لڑتا رہا، پچاس دن تک اکیلا مزاحمت کرتا رہا۔ اسلامی حکومتیں غزہ کی مدد کیلئے آگے نہیں آئیں۔ انہوں نے اپنا مال وزر اور ڈالر غزہ کیلئے خرچ نہیں کیا۔ بعض نے البتہ صہیونی حکومت کی ضرور مدد کی۔ یہ بھی ایک دلیل ہے۔

تکفیریوں کا ایک اور شرمناک اقدام اور مزید ایک دلیل یہ ہے کہ تکفیری تحریک نے پورے عالم اسلام میں مسلمان نوجوانوں کے جوش وخروش کو غلط سمت دے دی۔ آج پورے عالم اسلام میں ایک

---

[1] سورۂ ممتحنہ، آیت ۸۔۹۔

جوش و جذبہ نظر آ رہا ہے، ان پر اسلامی بیداری نے اپنا اثر ڈالا ہے۔ وہ اسلام کے اعلیٰ اہداف کیلئے خدمت انجام دینے پر آمادہ ہیں، مگر اس تکفیری تحریک نے اس جوش و جذبے کو غلط سمت میں موڑ دیا۔ غفلت اور جہالت کے شکار جوانوں کو مسلمانوں کے سر کاٹنے اور کسی بستی کے بچوں اور عورتوں کے قتل عام پر مامور کر دیا۔

یہ تکفیری تحریک کے گھناؤنے اور ہولناک برے اعمال ہیں۔ ان شواہد اور قرائن سے سرسری طور پر نہیں گزرا جا سکتا۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ تکفیری تحریک، سامراج کی خدمت کر رہی ہے، اسلام کے دشمنوں کی مدد کر رہی ہے، امریکہ کی خدمت کر رہی ہے، مغرب کی خدمت کر رہی ہے اور صیہونی حکومت کی خدمت کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ بھی شواہد اور دلائل موجود ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی کہ امریکہ کے ٹرانسپورٹ طیارے سے جنگی ساز و سامان کی بڑی کھیپ، عراق کے ان علاقوں میں پہنچائی جاری ہے جہاں داعش گروہ موجود ہے اور جہاں اس گروہ کو ان وسائل کی ضرورت تھی وہاں فضا سے اسلحہ کی بارش کر کے ان کی مدد کی گئی۔ ہم نے سوچا شاید غلطی سے ایسا ہو گیا ہے، لیکن دوبارہ یہی واقعہ پیش آیا۔ مجھے جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق پانچ دفعہ یہ عمل انجام دہرایا گیا ہے۔ کیا پانچ دفعہ غلطی ہو سکتی ہے؟

یہی لوگ دوسری طرف داعش مخالف اتحاد تشکیل دیتے ہیں جو مکمل طور پر جھوٹ کا پلندہ اور ڈرامہ بازی ہے۔ یہ اتحاد دوسرے معاندانہ اہداف کے حصول کی کوشش میں ہے۔ وہ اس فتنہ کو شعلہ ور رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں رکھیں، مسلمانوں کے اندر داخلی جنگ مسلسل جاری رہے، یہ سلسلہ چلتا رہے، یہی ان کا ہدف ہے۔ البتہ آپ یہ یقین رکھیں کہ وہ اپنے اس ہدف میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

کچھ اہم فرائض ہیں جنہیں انجام دیا جانا چاہیے۔ اس دو روزہ کانفرنس کی مختلف کمیٹیوں میں آپ نے طریقہ کار پر غور کیا، جائزہ لیا، کچھ فرائض کا تعین کیا۔ میں دو تین اقدامات کے بارے میں عرض کروں گا جنہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

ایک تو یہ ہے کہ تکفیری تحریک کو جڑ سے ختم کرنے کیلئے تمام اسلامی مکاتب فکر کے علمائے کرام کی جانب سے ہمہ گیر، علمی و منطقی مہم کا آغاز ہونا چاہیے۔ یہ مسئلہ کسی ایک مکتب فکر سے مخصوص نہیں ہے۔ اسلام کا درد رکھنے والے، اسلام کو ماننے والے اور اسلام سے دلی ہمدردی رکھنے والے تمام مکاتب فکر اس فریضہ میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک عظیم علمی مہم کا آغاز ہونا چاہیے۔ وہ ''سلف صالح''[1] کی پیروی کے جھوٹے نعرے کے ساتھ میدان میں وارد ہوئے ہیں، تو ان کے اعمال و اقدامات سے ''سلف صالح'' کی بیزاری کو دین کی زبان میں، علمی طریقے سے اور صحیح عقل و منطق کے ذریعے ثابت کیا جائے۔ نوجوانوں کو نجات دلایئے! کچھ لوگ ان گمراہ کن افکار سے متاثر ہو جاتے ہیں اور بیچارے اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت اس آیہ کریمہ کے مصداق ہے جس میں ارشاد رب العزت ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝﴾

کہہ دیجئے! اے لوگو میں تمہیں سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے لوگوں سے باخبر کروں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا کی زندگی میں کوششیں رائیگاں چلی گئیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔[2]

یہ اس خام خیالی میں ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روز قیامت اللہ تعالیٰ سے کہیں گے:

﴿وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝﴾

پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا،

---

[1] ''حقیقی معنی میں سنت پیغمبرؐ کا اتباع کرنے والے''۔

[2] سورۂ کہف، آیت ۱۰۳۔ ۱۰۴۔

پالنے والے! ان کے عذاب کو دگنا کر دے، ان پر لعنت بھیج، بہت بڑی لعنت۔[1]

یہ بیچارے دراصل اسی آیہ مجیدہ کے مصداق ہیں۔ جو شخص دمشق کی مسجد میں ایک بزرگ مسلمان عالم دین کو قتل کر دے، وہ اسی زمرے میں قرار پائے گا۔ جو شخص دوسرے مسلمان کو دین سے منحرف قرار دے کر اس کا سر کاٹ رہا ہے، اسی گروہ میں شامل ہے، جو پاکستان میں، افغانستان میں، بغداد میں، عراق کے مختلف شہروں میں، شام میں اور لبنان میں دھماکے کر کے بے گناہوں کو خاک وخوں میں غلطاں کر رہے ہیں وہ اسی گروہ میں شامل ہیں جو روز قیامت کہے گا: ''پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا، پالنے والے! ان کے عذاب کو دگنا کر دے، ان پر لعنت بھیج''۔ قرآن میں ایک اور جگہ پر اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ﴾

دونوں کیلئے دگنا عذاب ہے۔[2]

یعنی اللہ ان کی یہ التجا قبول نہیں کرے گا جس میں وہ اپنے سرداروں کیلئے دگنے عذاب کی درخواست کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ: ﴿رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (پروردگار! انہیں دہرے عذاب میں مبتلا کر) بلکہ آواز قدرت آئے گی: ﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ﴾ یعنی صرف سرادروں کیلئے ہی دوہرا عذاب نہیں بلکہ تم بھی اس دوہرے عذاب میں گرفتار کئے جاؤ گے۔ تابع اور متبوع دونوں کو اللہ کا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ یہ وہاں آپس میں دست وگریباں ہوں گے۔[3]

پس ان نوجوانوں کو نجات دلانا چاہیے، انہیں بچانا چاہیے اور یہ علماء کا فرض اور ان کی ذمہ داری ہے۔ علماء کا رابطہ دانشور طبقے سے بھی ہوتا ہے اور عوام سے بھی ہوتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ اس پر اپنی توانائیاں خرچ کریں۔ اللہ تعالی اس کے بارے میں روز قیامت علماء سے سوال کرے گا کہ آپ نے کیا کیا؟ ایک تو اس اقدام کی ضرورت ہے۔

---

[1] سورۂ احزاب، آیت ۶۷۔۶۸۔

[2] سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔

[3] جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ﴾: ''اہل جہنم کا باہمی جھگڑا ایک امر برحق ہے''۔ (سورۂ ص، آیت ۶۴)

دوسرا اقدام جو بہت ہی ضروری ہے، وہ اس بارے میں امریکہ اور مغرب کی سامراجی پالیسیوں پر پر روشنی ڈالنا ہے اور ان کی حقیقت کو سامنے لانا ہے۔ عالم اسلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ امریکی پالیسیوں کا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟ تکفیری تحریک کے احیاء میں امریکہ، مغرب اور صہیونی حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کا کیا کردار ہے؟ اسے سب ذہن نشین رکھیں، سب اس بات کو سمجھیں کہ یہ ایجنسیاں اپنا کام کر رہی ہیں، منصوبہ وہی بناتی ہیں، امداد کا کام وہی کرتی ہیں اور طریقہ کار وہی بتاتی ہیں جبکہ مالی وسائل فراہم کرنا علاقے میں ان کی آلہ کار حکومتوں اور ان کے گماشتہ حکمرانوں کا کام ہے۔ سرمایہ یہ لوگ دے رہے ہیں اور سازشیں وہ کر رہی ہیں اور ان بدبختوں کو تباہ کر رہی ہیں اور عالم اسلام کو اس بحران میں گرفتار کر رہی ہیں۔ یہ بھی بہت ضروری کام ہے جسے انجام دیا جانا چاہیے۔

تیسرا کام جسے لازمی طور پر انجام دیا جانا چاہیے، مسئلہ فلسطین پر بھرپور توجہ ہے۔ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ مسئلہ فلسطین، بیت المقدس کا مسئلہ اور مسجد الاقصیٰ کا مسئلہ فراموشی کی نذر کر دیا جائے۔ دشمن اسی کوشش میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عالم اسلام مسئلہ فلسطین سے غافل ہو جائے۔ آپ غور کیجئے، انہی دنوں کے دوران صہیونی حکومت کی کابینہ نے فلسطینی ملک کے یہودی ہونے کا اعلان کر دیا، اسے ایک یہودی ملک قرار دے دیا۔ وہ مدتوں سے اسی کوشش میں تھے اور اب صریحی طور پر انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ عالم اسلام پر طاری غفلت، مسلم اقوام اور عوام الناس پر چھائی بے خبری کے عالم میں صہیونی حکومت بیت المقدس پر قبضہ کر لینے کی کوشش میں ہے، مسجد الاقصیٰ کو ہڑپ لینے کی تگ و دو میں ہے، فلسطینیوں کو زیادہ سے زیادہ کمزور کر دینے کے درپے ہے، اس مسئلہ پر توجہ دینا ہوگی۔

تمام اقوام کو چاہیے کہ وہ اپنی حکومتوں سے مسئلہ فلسطین پر آواز اٹھانے کا مطالبہ کریں۔ علمائے کرام اپنی حکومتوں سے مطالبہ کریں کہ وہ مسئلہ فلسطین پر توجہ دیں۔ یہ ایک اہم اور بنیادی ذمہ داری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس معاملے میں اسلامی جمہوریہ ایران میں حکومت اور عوام میں مکمل فکری ہم آہنگی ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت نے، ہمارے عظیم القدر رہنما حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے دن سے ہی فلسطین کی حمایت اور صہیونی حکومت سے دشمنی کی پالیسی کا اعلان کر دیا اور اس پر عمل کیا جو آج تک

جاری ہے۔ پینتیس (۳۵) سال ہو گئے ہیں، ہم اس راستے پر گامزن ہیں۔ عوام بھی دل سے اور مکمل رغبت سے ہمارے ساتھ ہیں۔ بعض اوقات ہمارے کچھ نوجوان اس بارے میں مختلف مراکز سے رجوع کرتے ہیں اور کوئی جواب نہیں ملتا تو مجھے خط لکھتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اجازت دیجئے ہم اگلے محاذ پر جا کر صہیونی حکومت سے جنگ کریں۔ صہیونیوں کے خلاف جنگ کا انہیں عشق ہے۔ ہماری قوم، صیہونیوں سے جنگ کی خواہشمند ہے اور اسلامی جمہوریہ ایران نے اس کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ اللہ تعالی کی توفیق اور پروردگار کے لطف سے ہم مسلکی اختلافات جیسے مسائل کو عبور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم نے جو مدد حزب اللہ لبنان کو دی کہ جو شیعہ تنظیم ہے، وہی مدد حماس اور جہاد اسلامی تنظیم[1] کو بھی دی اور آئندہ بھی مدد دیتے رہیں گے۔ ہم فرقہ وارانہ محدودیتوں میں گرفتار نہیں ہوئے۔ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ یہ شیعہ ہے، وہ سنی ہے، یہ حنفی ہے وہ مالکی ہے، یہ شافعی ہے، وہ زیدی ہے۔ فلسطین کے ہر علاقہ کو ہتھیاروں سے لیس کیا جانا چاہیے۔

ہم نے اس اصلی اور بنیادی ہدف پر نظر مرکوز کی اور مدد کی، جس کے نتیجے میں ہم غزہ میں اپنے فلسطینی بھائیوں کے بازو مضبوط کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دیگر علاقوں میں بھی ہمیں کامیابی ملی ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

میں آپ عزیز بھائیوں کی خدمت میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ امریکی رعب و دبدبے سے آپ کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دشمن کمزور پڑ چکا ہے۔ اسلام کا دشمن عالمی سامراج اس وقت ماضی کے تمام ادوار کی نسبت گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کے مقابلے میں سب سے زیادہ کمزور حالت میں ہے۔ آپ یورپ کی استعماری حکومتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ اقتصادی مشکلات میں گرفتار ہیں، سیاسی مشکلات میں الجھی ہوئی ہیں، سکیورٹی سے متعلق مسائل سے دست و گریباں ہیں۔ آج یورپ کی استعماری طاقتیں گوناگوں مشکلات و مسائل کی شکار ہیں اور امریکہ کی حالت تو ان سے بھی زیادہ ابتر ہے۔ انہیں اخلاقی مشکلات، سیاسی مشکلات کے ساتھ شدید مالیاتی و اقتصادی بحران کا سامنا ہے۔ دنیا بھر میں

---

[1] فلسطین کی تنظیم ''جہاد اسلامی''۔

سپر پاور والی ان کی حیثیت خطرے میں پڑ چکی ہے۔

آج صہیونی حکومت صرف عالم اسلام میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ماضی کی نسبت کہیں زیادہ کمزور ہوگئی ہے۔ یہ وہی حکومت ہے جو ''نیل سے فرات تک'' کا نعرہ لگاتی تھی! یہ لوگ چیخ چیخ کر یہ نعرہ لگاتے تھے، صاف طور پر کہتے تھے کہ نیل سے فرات تک کا علاقہ ہماری ملکیت ہے، مگر یہی حکومت پچاس دنوں تک جاری رہنے والی غزہ جنگ میں فلسطینیوں کی سرنگوں کو فتح نہیں کر پائی۔ یہ وہی حکومت ہے جس نے پچاس دن تک اپنی ساری طاقت جھونک دی کہ حماس اور جہاد اسلامی کی بنائی ہوئی سرنگوں کو مسمار کر دے، نابود کر دے، اپنے قبضہ میں لے لے، مگر ناکام رہی۔ یہی وہ حکومت ہے جس کا دعویٰ تھا کہ نیل سے فرات تک کا علاقہ ہمارا ہے۔ آپ دیکھئے کہ یہ کتنی بدل چکی ہے، کتنی کمزور ہوگئی ہے۔ اسلام کے دشمن گوناگوں مشکلات میں گرفتار ہیں۔ عراق میں اسلام دشمن طاقتوں کو ناکامی کا سامنا ہے، شام میں بھی شکست و ناکامی سے دوچار ہیں، لبنان میں بھی شکست و ناکامی کا سامنا ہے، ان کا مختلف علاقوں میں ہدف پورا نہیں ہوسکا، مقاصد ناقص اور ادھورے رہ گئے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے مقابلے میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایٹمی مسئلے میں امریکہ اور یورپ کی استعماری حکومتیں متحد ہوئیں، انہوں نے اپنی ساری توانائی استعمال کر ڈالی کہ ایٹمی مسئلے میں اسلامی جمہوریہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں لیکن نہ تو کامیاب ہوئیں اور نہ ہی مستقبل میں کامیاب ہوں گی۔ یہ ہمارے مدمقابل فریق کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ آپ ان شاء اللہ روز بروز زیادہ طاقتور اور قوی تر ہوں گے۔ مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ﴾[1] ''اللہ اپنے امور پر مکمل دسترس رکھتا ہے''۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

[1] سورۂ یوسف آیت ۲۱۔

دُعائے کمیل پر ایک نظر

حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی

دُعائے کمیل کی سند

علامہ مجلسیؒ کے مطابق، دُعائے کمیل بہترین دُعا ہے۔ یہ دُعا نبی خدا حضرت خضر علیہ السلام سے منسوب ہے اور حضرت امام علی علیہ السلام نے اسے اپنے ایک ممتاز صحابی جناب کمیل ابن زیاد نخعی کو تعلیم فرمایا ہے۔ اگرچہ ظاہراً حضرت خضرؑ علیہ السلام نے پہلے پہل اس دُعا کو مرتب کیا تھا، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیونکہ وہ ابھی تک حیات ہیں اور ہر زمانے کی حجت کے ساتھ ہوتے ہیں، اس لئے شاید وہ اصل میں امام علیؑ سے متاثر رہے ہوں۔

بہرحال جناب کمیل اس بارے میں خود بیان کرتے ہیں:

كُنْتُ جَالِسًا مَعَ مَوْلَایَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (ع) فِیْ مَسْجِدِ الْبَصْرَةِ وَ مَعَهٗ جَمَاعَةٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ. فَقَالَ بَعْضُهُمْ: مَا مَعْنٰی قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ: ﴿فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ﴾[1] قَالَ: (ع): لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَ الَّذِیْ نَفْسُ عَلِیٍّ بِیَدِهٖ! اِنَّهٗ مَا مِنْ عَبْدٍ اِلَّا وَ جَمِیْعُ مَا یَجْرِیْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْرٍ وَّ شَرٍّ، مَقْسُوْمٌ لَّهٗ فِیْ لَیْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِلٰی اٰخِرِ السَّنَةِ فِیْ مِثْلِ تِلْكَ اللَّیْلَةِ الْمُقْبِلَةِ وَ مَا مِنْ عَبْدٍ یُحْیِیْهَا وَ یَدْعُوْ بِدُعَآءِ الْخِضْرِ (ع) اِلَّا اُجِیْبَ

(۱) سورۂ دخان، آیت ۴۔

[لَهٗ]. فَلَمَّا انْصَرَفَ طَرَقْتُهٗ لَيْلًا. فَقَالَ (ع): مَا جَآءَ بِكَ يَا كُمَيْلُ! قُلْتُ: يَآ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! دُعَآءُ الْخِضْرِ. فَقَالَ: اِجْلِسْ يَا كُمَيْلُ! اِذَا حَفِظْتَ هٰذَا الدُّعَآءَ فَادْعُ بِهٖ كُلَّ لَيْلَةَ جُمُعَةٍ اَوْ فِي الشَّهْرِ مَرَّةً اَوْ فِي السَّنَةِ مَرَّةً اَوْ فِيْ عُمُرِكَ مَرَّةً. تُكْفَ وَ تُنْصَرُ وَ تُرْزَقُ وَلَنْ تَعْدَمَ الْمَغْفِرَةَ. يَا كُمَيْلُ! اَوْجَبَ لَكَ طُوْلُ الصُّحْبَةِ لَنَا اَنْ نَجُوْدَ لَكَ بِمَا سَئَلْتَ. ثُمَّ قَالَ (ع): اُكْتُبْ۔

میں اپنے مولا و آقا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں بصرہ کی (جامع) مسجد میں بیٹھا تھا۔ اس موقع پر آپؑ کے کچھ دیگر اصحابؓ بھی تشریف فرما تھے۔ ایک صحابی نے عرض کی! (مولا!) اس آیہ مجیدہ جس میں ارشاد ہے: ''اس رات میں تمام حکمت و مصلحت کے امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے'' کا کیا معنی ہے؟ آپؑ نے فرمایا: اس رات سے مراد نیمۂ شعبان کی رات ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں علیؑ کی جان ہے! نیمۂ شعبان کی اس رات میں اگلے سال اسی رات تک کے ہر انسان کے نیک و بد تمام امور کی تقسیم انجام پاتی ہے۔ جو بندۂ خدا اس رات کو شب بیداری کرے اور دُعائے خضرؑ پڑھے، اس کی دُعا ضرور قبول ہوگی۔ پھر جب مولاؑ وہاں سے تشریف لے گئے تو میں رات کے وقت آپؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ آپؑ نے فرمایا: کیسے آنا ہوا؟ تو عرض کی: مولاؑ! ''دُعائے خضر'' کیلئے۔ آپؑ نے فرمایا: اے کمیل! بیٹھ جاؤ۔ جب اس دُعا کو حفظ کر لو تو اسے ہر شبِ جمعہ، یا ہر مہینے، یا سال میں ایک مرتبہ یا پھر پوری زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لینا، یہ تمہارے لئے کافی ہوگی، تمہیں نصرت نصیب ہوگی، روزی کے دروازے کھل جائیں گے اور تمہاری ضرور مغفرت ہوگی۔ اے کمیل! تمہاری ہمارے ساتھ اتنی طویل رفاقت باعث بنی ہے کہ اس گوہر گراں بہا کو تمہیں عطا کیا جائے۔ پس لکھو!۔[1]

---

(۱) الاقبال بالاعمال الحسنہ، سیّد بن طاؤس، دار الکتب الاسلامیہ، اشاعت دوم، تہران، ۷۷۔۱۳۷۶ ہجری شمسی، ج ۳، ص ۳۳۱۔

دُعائے کمیل کے مصادر

اس بیش قیمت دعا کا کئی دوسری کتابوں کے علاوہ ان کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے:

- مصباح المتہجد، شیخ طوسیؒ (۳۸۵۔۴۶۰)، قم، اسماعیل زنجانی، ۱۴۰۱ھ، ص ۷۷۴۔۷۸۱)۔
- اقبال الاعمال، سیّد ابن طاؤس (۵۸۹۔۶۶۴)، تہران، دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۰ھ، ص ۷۰۶۔۷۱۰۔
- البلد الامین، ابراہیم بن علی العاملی الکفعمی (۸۴۰۔۹۰۵)، ص ۱۸۸۔۱۹۱۔
- المصباح، ابراہیم بن علی العاملی الکفعمی (۸۴۰۔۹۰۵)، قم، دار الرضی، ۱۴۰۵ھ، ص (۵۵۵۔۵۶۰)

دعائے کمیل کے عظیم الشان مطالب ومعارف

دُعائے کمیل میں کئی علمی خیالات اور گزارشات پائے جاتے ہیں جن میں سب سے زیادہ امتیاز توبہ اور مغفرت کو ہے۔ مغفرت کو اسلام میں ایسا درجہ حاصل ہے کہ اس کے بغیر ہر چیز بے کار قرار دی گئی ہے۔ یعنی اگر ہماری مغفرت نہ ہو تو کوئی اور چیز فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اگر ہم مغفرت پالیں تو اور چیزوں کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلے تو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ہمیں معاف کیا جا چکا ہے۔ اس عظیم الشان دُعا میں حضرت امام علی علیہ السلام مغفرت کے علاوہ اور چیزوں کی بھی درخواست کرتے ہیں کہ جن میں سے ایک یادِ خدا ہے۔ اس بارے میں آپؑ نے اس دُعا میں فرمایا:

وَ اجْعَلْ لِّسَانِیْ بِذِکْرِکَ لَهِجًا۔

اور میری زبان پر تیری یاد نمایاں ہو۔

ایک اور جگہ پر امامؑ فرماتے ہیں:

یَا مَنِ اسْمُهٗ دَوَآءٌ وَّ ذِکْرُهٗ شِفَآءٌ۔

اے وہ ذات جس کا نام دوا ہے اور جس کی یاد شفا ہے۔

اور پھر فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَتَقَرَّبُ اِلَیْکَ بِذِکْرِکَ۔

اے اللہ! میں تیرے ذکر کے ذریعے تیرا قرب چاہتا ہوں۔

یہاں حضرت امام علی علیہ السلام یادِ خدا کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں اور واضح فرما رہے ہے کہ اگر ہمیں جہنم میں بھی ڈال دیا جائے، ہم پھر بھی پروردگار اور اس کی رحمتوں کو یاد رکھیں گے۔

یاد خدا اور مغفرت کے علاوہ بھی دوسری حاجات کا بھی تذکرہ ہے۔ مثلاً رزق، دشمنوں کے شر سے حفاظت اور عشق خداوندی وغیرہ۔

ا۔ توبہ:

اسلامی روحانیت میں توبہ ایک نہایت اعلی درجے کا نام ہے اور دُعائے کمیل میں موجود حاجات میں سب سے اہم یہی توبہ ہے۔ البتہ سب سے پہلا سوال جو ہم پوچھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں توبہ کیوں کرنی چاہئے؟ حضرت امام علی علیہ السلام اس دُعا میں نہایت بلاغت کے ساتھ واضح کرتے ہیں کہ توبہ کو ثانوی یا اضافی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ یہ اولین ترجیح کی حامل ہے، کیونکہ ہم خداوند کی سزا کو برداشت نہیں کر سکتے۔ امام علی علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ خدائی سزائیں بہت سخت ہیں جبکہ ہم بہت کمزور اور ہمارا جسم اور جلد بھی ضعیف اور ناتوان۔ اس حقیقت کو آپؑ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

يَا رَبِّ ارْحَمْ ضَعْفَ بَدَنِيْ وَ رِقَّةَ جِلْدِيْ وَ دِقَّةَ عَظْمِيْ۔

اے میرے رب! میرے جسم کی ناتوانی، میری جلد کی فرسودگی اور میری ہڈیوں کی نزاکت پر رحم فرما۔

حضرت امام علی علیہ السلام دُعائے کمیل میں ایک اور مقام پر اس منزل سے ذرا اور آگے بڑھ کر واضح کرتے ہیں اگر ایک اطاعت گزار بندہ ان سختیوں کو جھیل بھی جائے تو پھر بھی روحانی اور فکری لحاظ سے یہ برداشت نہیں کر پائے گا کہ خداوند تعالیٰ اسے سزا دے رہا ہے اور وہ اس کے لطف و کرم سے محروم ہے۔ چنانچہ آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

فَهَبْنِيْ يَا اِلٰهِيْ وَ سَيِّدِيْ وَ مَوْلَايَ وَ رَبِّيْ صَبَرْتُ عَلٰى عَذَابِكَ فَكَيْفَ اَصْبِرُ عَلٰى فِرَاقِكَ وَ هَبْنِيْ صَبَرْتُ عَلٰى حَرِّ نَارِكَ فَكَيْفَ اَصْبِرُ عَنِ النَّظَرِ اِلٰى كَرَامَتِكَ اَمْ

كَيْفَ اَسْكُنُ فِي النَّارِ وَ رَجَآئِيْ عَفْوُكَ۔

اے میرے معبود! اے میرے مالک! اے میرے مولا! اور اے میرے پروردگار! میں تیرے عذاب پر اگر صبر بھی کرلوں تو تیری رحمت سے جدائی پر کیونکر صبر کرسکوں گا اور اسی طرح اگر میں تیری آتش جہنم کی تپش برداشت بھی کرلوں تو تیری نظر کرم سے اپنی محرومی کیسے برداشت کرسکوں گا یا میں آتش جہنم میں کیسے ٹھہرا رہوں گا جبکہ مجھے تجھ سے عفوودرگزر کی امید ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بندۂ خدا کیلئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ باقی سب لوگوں کو خداوند کی مرحمت ملے اور اسے محروم رکھا جائے، جبکہ اس نے خداوند سے محبت بھی کی اور پوری زندگی امید بھی رکھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند اس شخص کو جہنم میں ڈال دے جس نے خدا سے محبت بھی کی ہو اور خداوند کو اپنا پروردگار مانا ہو اور صرف اسی کو ہی سب کچھ مانا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خداوند اس کو جہنم میں ڈالے اور وہیں چھوڑ دے جو اس کو پکار رہا ہو؟ یقیناً ایسا شخص جہنم میں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ارشاد ہے:

اَفَتُرَاكَ سُبْحَانَكَ يَآ اِلٰهِيْ وَ بِحَمْدِكَ تَسْمَعُ فِيْهَا صَوْتَ عَبْدٍ مُّسْلِمٍ سُجِنَ فِيْهَا بِمُخَالَفَتِهٖ وَ ذَاقَ طَعْمَ عَذَابِهَا بِمَعْصِيَتِهٖ وَ حُبِسَ بَيْنَ اَطْبَاقِهَا بِجُرْمِهٖ وَجَرِيْرَتِهٖ وَ هُوَ يَضِجُّ اِلَيْكَ ضَجِيْجَ مُؤَمِّلٍ لِرَحْمَتِكَ وَ يُنَادِيْكَ بِلِسَانِ اَهْلِ تَوْحِيْدِكَ وَ يَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِرُبُوْبِيَّتِكَ يَا مَوْلَايَ فَكَيْفَ يَبْقٰى فِي الْعَذَابِ وَ هُوَ يَرْجُوْ مَا سَلَفَ مِنْ حِلْمِكَ وَ رَاْفَتِكَ۔

اے میرے معبود! میں تیری حمد کرتا ہوں (میں حیران ہوں کہ یہ کیونکر ہوگا کہ) تو (اسی آگ میں سے) ایک بندہ مسلم کی آواز سنے جو اپنی نافرمانی کی پاداش میں اس میں قید کردیا گیا ہو، جسے گناہ کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھایا گیا ہو، مگر وہ تیری رحمت کے امیدوار کی طرح تیرے حضور میں فریاد کرتا ہو، تیری توحید کو ماننے والوں کی سی زبان سے تجھے پکارتا ہو اور تیری ربوبیت کے واسطے سے تیری جناب کا سہارا چاہتا ہو۔ اے

مالک! پھر وہ اس عذاب میں کیسے رہ سکے گا جب کہ اسے تیرے گزشتہ حلم وکرم اور مہربانی کی آس بندھی ہوگی۔

ان سب سوالوں کا جواب دیتے ہوئے حضرت امام علی علیہ السلام واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ایسا ہر گز نہیں ہوسکتا، یہ چیز خداوند کی ذات سے بعید از قیاس ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

مَا ذٰلِكَ الظَّنُّ بِكَ وَ لَا الْمَعْرُوْفُ مِنْ فَضْلِكَ وَ لَا مُشْبِهٌ لِّمَا عَامَلْتَ بِهِ الْمُوَحِّدِيْنَ مِنْ بِرِّكَ وَ اِحْسَانِكَ۔

تیرے بارے میں ایسا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی تیرے فضل وکرم کی ایسی شہرت رہی ہے اور نہ ہی یہ سلوک تیرے اس لطف وکرم سے میل کھاتا ہے جو تو نے اپنے موحد بندوں سے روا رکھا ہے۔

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خدا کے شایان شان نہیں ہے، کیونکہ ایسے کسی شخص کو خداوند جہنم میں ڈالے، اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ایک ایسا شخص جو ظاہراً خداوند سے محبت کرتا ہے۔ وہ شخص یہ اظہار کر رہا ہے کہ اگر اسے جہنم کی آگ میں بھی ڈال دیا جائے اور سزا بھی دی جائے تو پھر بھی خدا سے محبت اس کے دل میں ہے، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ ساری سزا اس کی اپنی خطاؤں کی وجہ سے ہے۔ تمام الٰہی فیصلے صحیح ہیں۔ یہ محبت حقیقی اور سچی ہے اور دھوکہ دینے والی نہیں اور وہ شخص جو خداوند کی محبت دکھاوے کیلئے کرتا ہے اور دل سے خداوند سے محبت نہیں کرتا، ایسا شخص جیسے ہی اسے پریشانیاں گھیریں گی، وہ خداوند کو الزام دے گا اور اس سے شکایات شروع کردے گا۔

۲۔ الٰہی سزائیں:

حضرت امام علی علیہ السلام سلسلہ دُعا کو جاری رکھتے ہوئے مزید ارشاد فرماتے ہیں:

فَبِالْيَقِيْنِ اَقْطَعُ لَوْلَا مَا حَكَمْتَ بِهٖ مِنْ تَعْذِيْبِ جَاحِدِيْكَ وَ قَضَيْتَ بِهٖ مِنْ اِخْلَادِ مُعَانِدِيْكَ لَجَعَلْتَ النَّارَ كُلَّهَا بَرْدًا وَّ سَلَامًا وَّ مَا كَانَ لِاَحَدٍ فِيْهَا مَقَرًّا وَّ لَا مُقَامًا لٰكِنَّكَ تَقَدَّسَتْ اَسْمَآؤُكَ اَقْسَمْتَ اَنْ تَمْلَأَهَا مِنَ الْكَافِرِيْنَ مِنَ

الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ وَاَنْ تُخَلِّدَ فِيْهَا الْمُعَانِدِيْنَ۔

میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ اگر تو نے اپنے منکروں کو عذاب میں مبتلا کرنے کا فیصلہ نہ کرلیا ہوتا اور انہیں ہمیشہ جہنم میں رکھنے کا حکم نہ دے دیا ہوتا تو تو ضرور آتش جہنم کو ایسا سرد کر دیتا کہ وہ جائے سلامتی ہو جاتی اور پھر کسی بھی شخص کا ٹھکانہ جہنم نہ ہوتا، لیکن خود تو نے اپنے اسمائے حسنیٰ کے تقدس کی قسم کھائی ہے کہ تو تمام کافروں سے جو جنوں اور انسانوں میں سے ہیں، جہنم کو بھر دے گا اور اپنے دشمنوں کو ہمیشہ کیلئے اس میں رکھے گا۔

یہ فقرہ کئی اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ الٰہی عذاب حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔

۲۔ جو خداوند کے منکر ہیں وہ سزا پائیں گے اور جو خدا کے خلاف جنگ کرتے ہیں وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ یوں وہ لوگ جو خداوند کے منکر ہیں، مگر اس کے خلاف جنگ نہیں کرتے وہ جہنم میں مخصوص مدت کیلئے جائیں گے، لیکن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

۳۔ جہنم ایک لازمی اور ضروری مخلوق ہے وگرنہ خدا اسے ختم کر دے اور اسے ایک طرح کی جنت بنا دے۔

۴۔ جہنم ایمان رکھنے والوں کی منزل نہیں ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنا ایمان درست رکھتے ہیں اور اس کو نہ زندگی میں اور نہ موت کے وقت اور نہ اس کے بعد حتی کہ اگر انہیں پریشانیاں آئیں تب بھی وہ اس ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جہنم میں اگر ڈالا بھی جائے گا تو اس کا مقصد ان کی طہارت ہوگا تا کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں۔

البتہ ہمیں بہت محتاط اور باخبر رہنے کی ضرورت کی ہے کہ ہم خواہ مخواہ گناہ کے خطرات مول نہ لیں، کیونکہ کچھ ایسے گناہ بھی ہیں کہ جن سے ایمان ختم ہو جاتا ہے اور دُعائیں ردّ ہو جاتیں ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے بھی گناہ ہیں کہ جو خداوند کی رحمتوں کو عذاب اور مشکلات میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دُعائے کمیل کی ابتدا میں گناہوں کی اقسام گنواتے ہوئے حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تَھْتِكُ الْعِصَمَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تُنْزِلُ النِّقَمَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تُغَیِّرُ النِّعَمَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تَحْبِسُ الدُّعَآءَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تَقْطَعُ الرَّجَآءَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تُنْزِلُ الْبَلَآءَ۔

اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جو برائیوں سے محفوظ رکھنے والی پناہ گاہوں کو مسمار کردیتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جو عذاب ہونے کی وجہ بنتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جو نعمتوں کو بدل کر انہیں آفت بنادیتے ہیں۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جو دُعائیں قبول نہیں ہونے دیتے۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جن کی وجہ سے رحمت کی امید ختم ہوجاتی ہے۔ اے اللہ! میرے وہ سب گناہ معاف کردے جو مصیبتیں نازل کراتے ہیں۔

دُعا کے اس حصے کی بنیاد پر کچھ ایسے گناہ ہیں جو دُعاؤں اور عبادات کے قبول نہ ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ دُعا کو خدا تک پہنچنے کیلئے بلند سے بلند تر ہونا پڑتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے شخص کو مدد کیلئے پیغام پہنچا رہے ہیں جو بہت مہربان ہے تو اس میں شک نہیں کہ جب اسے پیغام ملے تو وہ مدد کیلئے آئے گا، مگر آپ کو یہ یقین کرلینا چاہیے کہ یہ پیغام اس کو مل چکا ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ نے یہ پیغام غلط لفافے میں ڈال دیا یا صحیح اسٹامپ نہیں لگایا تو کوئی مدد نہیں پہنچے گی، کیونکہ وہ پیغام پہنچا ہی نہیں۔ اسی طرح ہمیں اس بات کو بھی یقینی بنانا ہے کہ ہماری دُعائیں خدا تک پہنچ رہی ہیں، کیونکہ کچھ ایسے گناہ بھی ہیں جو خدا تک ان کے پہنچنے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور چونکہ ہمیں معلوم نہیں ہے یہ کونسے گناہ ہیں، اس لئے کوئی بھی گناہ انجام دیتے وقت ہمیں محتاط ہونا چاہئے کہ شاید یہ وہی گناہ ہو جو ہماری دُعا کے قبول نہ ہونے کا سبب بن جائے۔

یہی سب کچھ نیک اعمال اور رضائے خداوندی کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ ہمارے پاس کچھ ایسی روایات ہیں کہ جن میں کہا گیا ہے کہ خداوند کی رضا و خوشنودی کچھ نیک اعمال میں چھپی ہوئی ہے اور

چونکہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ ''اچھے اعمال'' کونسے ہیں، اسی لئے ہمیں اچھا عمل کرنے میں کوتاہی نہیں برتنی چاہئے کہ شاید یہی چھوٹا سا عمل خداوند کی خوشنودی کا باعث بنے۔

دوسری طرف، اللہ تعالیٰ نے اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی گناہوں میں چھپادی ہے۔ اس لئے یہاں بھی ہمیں احتیاط برتنی چاہئے کہ نہ جانے کس گناہ میں خداوند کا غضب اور ناراضگی چھپی ہوئی ہو۔

اس سلسلہ میں ایک روایت میں حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَخْفٰى اَرْبَعَةً فِيْ اَرْبَعَةٍ: اَخْفٰى رِضَاهُ فِيْ طَاعَتِهٖ فَلَا تَسْتَصْغِرَنَّ شَيْئًا مِّنْ طَاعَتِهٖ فَرُبَّمَا وَافَقَ رِضَاهُ وَاَنْتَ لَا تَعْلَمُ. وَاَخْفٰى سَخَطَهٗ فِيْ مَعْصِيَتِهٖ فَلَا تَسْتَصْغِرَنَّ شَيْئًا مِّنْ مَّعْصِيَتِهٖ فَرُبَّمَا وَافَقَ سَخَطَهٗ وَاَنْتَ لَا تَعْلَمُ وَاَخْفٰى اِجَابَتَهٗ فِيْ دَعْوَتِهٖ فَلَا تَسْتَصْغِرَنَّ شَيْئًا مِّنْ دُعَآئِهٖ فَرُبَّمَا وَافَقَ اِجَابَتَهٗ وَاَنْتَ لَا تَعْلَمُ وَاَخْفٰى وَلِيَّهٗ فِيْ عِبَادِهٖ فَلَا تَسْتَصْغِرَنَّ عَبْدًا مِّنْ عَبِيْدِ اللهِ فَرُبَّمَا يَكُوْنُ وَلِيَّهٗ وَاَنْتَ لَا تَعْلَمُ۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کو چار چیزوں میں چھپادیا ہے: پروردگار نے اپنی رضا اور خوشنودی کو اپنی اطاعت میں چھپادیا ہے، اس لئے اطاعت کے کسی بھی عمل کو چھوٹا نہ سمجھو کہ شاید اسی عمل میں خدا تعالیٰ کی رضا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ناراضگی کو اپنی نافرمانی اور گناہ میں چھپادیا ہے، اس لئے کسی بھی گناہ کو چھوٹا مت سمجھو، کیونکہ شاید اسی میں خداوند کی ناراضگی چھپی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد دُعا میں چھپادی ہے، اس لئے کسی دُعا کو کم مت جانو، کیونکہ شاید اسی میں اس کی مدد مخفی ہو۔ خداوند نے اپنے خاص بندے مخلوق میں چھپادئے ہیں، اس لئے کسی بھی شخص کو کم تر مت جانو، کیونکہ شاید وہی خداوند کا خاص بندہ ہو۔ [1]

---

[1] خصال شیخ صدوقؒ، ج ۲، ص ۲۰۹۔ ۲۱۰۔

وہ دُعا جو کبھی ردّ نہیں ہوتی

یہاں ایک بہت اہم سوال اُٹھتا ہے کہ اگر کچھ ایسے گناہ ہیں جو ہماری دُعاؤں کے درمیان رکاوٹ بنتے ہیں اور ہم شاید پہلے ہی ایسے گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہوں تو پھر عین ممکن ہے کہ جس دُعا میں ہم خداوند سے معافی کے طلبگار ہوں وہی خداوند تک نہ پہنچے۔ اس لئے اگر ہم پہلے ہی ایسا کوئی گناہ کر چکے ہیں تو اس دُعا کے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر ہم نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا تو پھر ایسی کوئی دُعا پڑھنے کی ضرورت نہیں؟ اس اُلجھن کا کیا جواب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ استغفار وہ واحد دُعا ہے جو کبھی ردّ نہیں کی جاتی۔ اگر کوئی خداوند سے مغفرت طلب کرتا ہے تو وہ سنی بھی جائے گی اور جواب بھی آئے گا۔ اگرچہ گناہ بذات خود آپ کو استغفار کرنے سے روک سکتا ہے، لیکن اگر استغفار کر لے تو اس کے خداوند تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾﴾

توبہ خداوند کے ذمہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو جہالت کی بنا پر برائی کرتے ہیں اور پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں کہ خداوند ان کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ علیم و دانا بھی ہے اور صاحب حکمت بھی۔ [1]

اس آیت کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ اس شخص کی توبہ کو قبول کرے گا کہ جس نے لاعلمی میں گناہ کیا ہو اور مرنے سے پہلے توبہ کر لے۔ اسی لئے جب تک انسان خلوص کے ساتھ استغفار کرتا ہے تو اسے خداوند کی ذات سے امید رکھنی چاہیے۔ سب سے بدترین مقام وہ ہے کہ جہاں انسان یہ سمجھتے ہوئے استغفار نہیں کرتا کہ میں نے تو کچھ غلط کیا ہی نہیں۔ وہ دوسروں کو گنہگار جانتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں سے پاک سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کی بدترین سزا، استغفار کی توفیق نہ پانا ہے۔

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۱۷۔

اس دُعا کے آخر میں حضرت امام علی علیہ السلام دوبارہ ہمیں توبہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اس کی اہمیت ایسے واضح کرتے ہیں:

اِلٰهِیْ وَ سَیِّدِیْ فَاَسْئَلُكَ بِالْقُدْرَةِ الَّتِیْ قَدَّرْتَهَا وَ بِالْقَضِیَّةِ الَّتِیْ حَتَمْتَهَا وَ حَكَمْتَهَا وَ غَلَبْتَ مَنْ عَلَیْهِ اَجْرَیْتَهَا اَنْ تَهَبَ لِیْ فِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ وَ فِیْ هٰذِهِ السَّاعَةِ كُلَّ جُرْمٍ اَجْرَمْتُهٗ وَ كُلَّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ وَ كُلَّ قَبِیْحٍ اَسْرَرْتُهٗ وَ كُلَّ جَهْلٍ عَمِلْتُهٗ كَتَمْتُهٗ اَوْ اَعْلَنْتُهٗ اَخْفَیْتُهٗ اَوْ اَظْهَرْتُهٗ وَ كُلَّ سَیِّئَةٍ اَمَرْتَ بِاِثْبَاتِهَا الْكِرَامَ الْكَاتِبِیْنَ۔

اے میرے معبود! اے میرے مالک! میں تجھے تیری اس قدرت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس سے تو نے موجودات کی تقدیر بنائی اور تیرے ان حتمی فیصلوں کا جنہیں تو نے اٹل و نا قابل تبدیل حیثیت سے نافذ کیا ہے اور تو ان پر غالب ہے جن پر یہ حکم لاگو ہیں کہ تو بخش دے اور معاف کر دے، اسی رات اور اسی لمحے، ہر وہ جرم جس کا میں مرتکب ہوا ہوں اور ہر وہ گناہ جو میں نے کیا ہے اور ہر وہ برائی جو میں نے چھپائی ہے اور ہر وہ نادانی جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے، چاہے چھپی ہوئی ہو یا کھلم کھلا، مخفی رکھی ہو یا ظاہر کی ہو، میری ہر ایسی بدعملی کو معاف کر دے جس کے لکھنے کا حکم تو نے کرام الکاتبین کو دیا ہے۔

دعائے کمیل میں موجود معارف کا اجمالی جائزہ

اس دُعا میں ہم ایک جگہ پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ مَوْلَایَ كَمْ مِّنْ قَبِیْحٍ سَتَرْتَهٗ وَ كَمْ مِّنْ فَادِحٍ مِّنَ الْبَلَآءِ اَقَلْتَهٗ وَ كَمْ مِّنْ عِثَارٍ وَّقَیْتَهٗ وَ كَمْ مِّنْ مَكْرُوْهٍ دَفَعْتَهٗ وَ كَمْ مِّنْ ثَنَآءٍ جَمِیْلٍ لَّسْتُ اَهْلًا لَّهٗ نَشَرْتَهٗ۔

اے اللہ! اے میرے مالک! تو نے میری کتنی ہی برائیوں کی پردہ پوشی کی۔ تو نے مجھ پر سے کتنی ہی سخت بلاؤں کو ٹال دیا۔ تو نے مجھے کتنی ہی لغزشوں کی رسوائی سے بچالیا۔ تو نے مجھ سے بے شمار ناگوار آفات کو دور کیا اور کتنی ہی ایسی خوبیاں جن کا میں اہل بھی نہ تھا، تو نے لوگوں میں مشہور کر دیں۔

یہاں حضرت امام علی علیہ السلام، خداوند کی ان عطاؤں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس نے اپنے گنہگار بندوں پر کیں ہیں۔ یہ خدا ہی ہے کہ جس نے اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کی اور مصیبتوں اور بلاؤں کو ان سے، ان کے خاندان سے اور ان کے احباب سے ٹال دیا ہے۔ یہ خدا ہی ہے کہ جس نے اپنے کرم کی وجہ سے اپنے بندوں کو دوسروں کے سامنے ایسی عزت اور وقار سے نوازا کہ جس کے وہ مستحق نہیں تھے اور اگر لوگ ان کے بارے میں جان جاتے تو ان کی تعریف چھوڑ دیتے۔

اَللّٰھُمَّ عَظُمَ بَلَآئِیْ وَ اَفْرَطَ بِیْ سُوْٓءُ حَالِیْ وَ قَصُرَتْ بِیْٓ اَعْمَالِیْ وَ قَعَدَتْ بِیْٓ اَغْلَالِیْ وَ حَبَسَنِیْ عَنْ نَفْعِیْ بُعْدُ اَمَلِیْ وَ خَدَعَتْنِی الدُّنْیَا بِغُرُوْرِھَا وَ نَفْسِیْ بِجِنَایَتِھَا وَ مِطَالِیْ۔

اے اللہ! میری آزمائش بہت عظیم ہے، میری بدحالی حد سے بڑھ گئی ہے، میرے اعمال نے مجھے عاجز کر دیا ہے، اپنے گناہوں کی وجہ سے میرے ہاتھ گردن سے بندھ گئے ہیں۔ میری امیدوں کی درازی نے مجھے نفع سے محروم کر رکھا ہے، دنیا نے اپنی جھوٹی چمک دمک سے مجھے دھوکہ دیا ہے اور میرے نفس نے اپنے گناہوں اور ٹال مٹول کے باعث فریب دیا ہے۔

اس حصے میں حضرت امام علی علیہ السلام نے بندے کی بدحالی بیان کی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان کی بدحالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ان کے نیک اعمال بہت کم اور نہایت کم درجہ کے ہیں۔ بہت ساری رکاوٹیں انہیں روکے ہوئے ہیں۔ لمبی امیدوں، سوہانے خوابوں اور بلند پروازیوں نے انہیں مغرور کر دیا ہے، کیونکہ انہیں جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا تقابل اپنی خواہشات اور خواب وخیال سے کرتے ہیں اور اسے

ناکافی پا کر ردّ کر دیتے ہیں اور مزید کچھ نہیں کرتے۔ چنانچہ ہر کسی کو حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے خواہشات رکھنی چاہئیں تا کہ ان کیلئے وہ تگ ودو کر سکیں۔ اس کے علاوہ دنیا اور ان کے اپنے نفس نے ان کو دغا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کی مدد کرے اور اس راہ میں ان کی حوصلہ افزائی کرے، ان کے نفس نے ان کو دھوکہ دیا ہے۔ یہ ان کی بدحالی کا قصہ ہے اور گو کہ خدا نے ان پر اتنی عطائیں کی ہیں مگر وہ خدا کے شکر گزار بندے نہیں ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس حالت تک پہنچنے کے باوجود ہم خدا ہی سے گزارش کرتے ہیں کہ تو اپنی نعمتوں کی تکمیل کر دے۔ اگر ہم کسی کے گھر دعوت پر جائیں اور وہ ہمارے سامنے سب کچھ رکھ دے سوائے پانی کے تو ہم اس کو ایک کامل میزبان نہیں کہیں گے۔ یا مثلاً ایک استاد سارا سال اسکول کھولتا ہے اور پڑھاتا ہے، لیکن یہ کہہ کر صرف ایک ہفتہ کیلئے اسکول بند کر دیتا ہے کہ ہم تعلیم دے چکے ہیں تو یہ اس کے بارے میں ایک اچھا تاثر نہیں چھوڑے گا۔ عربی زبان میں ایک محاورہ ہے کہ ''اَلْاِکْرَامُ بِالْاِتْمَامِ'': بھلائی وہی جو کامل ہو۔ یہاں ہم خداوند کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

یَا سَیِّدِیْ فَاَسْئَلُکَ بِعِزَّتِکَ اَنْ لَّا یَحْجُبَ عَنْکَ دُعَآئِیْ سُوْٓءُ عَمَلِیْ وَ فِعَالِیْ وَ لَا تَفْضَحْنِیْ بِخَفِیِّ مَا اطَّلَعْتَ عَلَیْہِ مِنْ سِرِّیْ وَ لَا تُعَاجِلْنِیْ بِالْعُقُوْبَۃِ عَلٰی مَا عَمِلْتُہٗ فِیْ خَلَوَاتِیْ مِنْ سُوْٓءِ فِعْلِیْ وَ اِسَآئَتِیْ وَ دَوَامِ تَفْرِیْطِیْ وَ جَھَالَتِیْ وَ کَثْرَۃِ شَھَوَاتِیْ وَ غَفْلَتِیْ وَ کُنِ اللّٰھُمَّ بِعِزَّتِکَ لِیْ فِیْ کُلِّ الْاَحْوَالِ رَؤُفًا وَّ عَلَیَّ فِیْ جَمِیْعِ الْاُمُوْرِ عَطُوْفًا۔

اے میرے آقا! تجھے تیری عزت کا واسطہ، تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میری بداعمالیاں اور غلط کاریاں میری دُعا کے قبول ہونے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ میرے جن بھیدوں سے تو واقف ہے تو ان کی وجہ سے مجھے رسوا نہ کرنا اور خلوتوں میں انجام دیئے گئے ان اعمال پر سزا دینے میں جلدی نہ کرنا جن میں میرے برے افعال، گستاخی، میری دائمی کوتاہی، جہالت، میری کثرت خواہشِ نفس اور غفلت شامل ہیں۔ اے اللہ! اپنی

عزت کے طفیل مجھ پر ہر حال میں مہربان رہ اور میرے تمام معاملات میں اپنا لطف و کرم فرما۔

یہاں ہم سوال کر رہے ہیں کہ اللہ نے ۹۵ فیصد کام کر دیا ہے اور ۵ فیصد باقی ہے، جبکہ وہ ۵ فیصد ہماری فلاح میں نہایت اہم ہوسکتا ہے۔

ایک اور جگہ ہم پڑھتے ہیں:

اَنْ تَهَبَ لِيْ فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَ فِيْ هٰذِهِ السَّاعَةِ كُلَّ جُرْمٍ اَجْرَمْتُهٗ وَ كُلَّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ وَ كُلَّ قَبِيْحٍ اَسْرَرْتُهٗ وَ كُلَّ جَهْلٍ عَمِلْتُهٗ كَتَمْتُهٗ اَوْ اَعْلَنْتُهٗ اَخْفَيْتُهٗ اَوْ اَظْهَرْتُهٗ وَ كُلَّ سَيِّئَةٍ اَمَرْتَ بِاِثْبَاتِهَا الْكِرَامَ الْكَاتِبِيْنَ الَّذِيْنَ وَكَّلْتَهُمْ بِحِفْظِ مَا يَكُوْنُ مِنِّيْ وَ جَعَلْتَهُمْ شُهُوْدًا عَلَيَّ مَعَ جَوَارِحِيْ وَ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيَّ مِنْ وَّرَآئِهِمْ وَ الشَّاهِدَ لِمَا خَفِيَ عَنْهُمْ وَ بِرَحْمَتِكَ اَخْفَيْتَهٗ وَ بِفَضْلِكَ سَتَرْتَهٗ وَاَنْ تُوَفِّرَ حَظِّيْ مِنْ كُلِّ خَيْرٍ اَنْزَلْتَهٗ اَوْ اِحْسَانٍ فَضَّلْتَهٗ اَوْ بِرٍّ نَشَرْتَهٗ اَوْ رِزْقٍ بَسَطْتَهٗ اَوْ ذَنْبٍ تَغْفِرُهٗ اَوْ خَطَاٍ تَسْتُرُهٗ يَا رَبِّ يَا رَبِّ يَا رَبِّ۔

اے پروردگار! تو بخش دے اور معاف کر دے، اسی رات اور اسی لمحے، ہر وہ جرم جس کا میں مرتکب ہوا ہوں اور ہر وہ گناہ جو میں نے کیا ہے اور ہر وہ برائی جو میں نے چھپائی ہے اور ہر وہ نادانی جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے، چاہے چھپی ہوئی ہو یا کھلم کھلا، مخفی رکھی ہو یا ظاہر کی ہو۔ میری ہر ایسی بدعملی کو معاف کر دے کہ جس کو لکھنے کا حکم تو نے کرام الکاتبین کو دیا جنہیں تو نے میرے ہر عمل کو ثبت کرنے پر مامور کیا ہے اور انہیں میرے اعضاء کے ساتھ میرے اعمال کا گواہ مقرر کیا ہے، پھر ان سے بڑھ کر تو خود میرے اعمال کا نگران ہے اور ان باتوں سے بھی باخبر ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہ گئی ہیں اور جنہیں تو نے اپنی رحمت سے چھپایا ہے اور جن پر تو نے اپنے کرم سے پردہ ڈال دیا ہے۔ اے اللہ! مجھے زیادہ سے زیادہ حصہ دے ہر اس بھلائی میں سے جو تو نے نازل فرمائی، ہر اس

احسان میں سے جسے تو نے سرفراز فرمایا ہے۔ ہر اس نیکی میں سے جسے تو نے عام کیا ہے۔ ہر اس رزق میں سے جس میں تو نے وسعت دی ہے۔ ہر اس گناہ سے جسے تو نے معاف کر دیا ہے، ہر اس غلطی سے جسے تو نے چھپا دیا ہے۔ اے میرے پروردگار!

اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!

ان جملوں کو بنیاد بناتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں:

- ۱۔ جب بھی ہم کوئی عمل کرتے ہیں تو روز محشر ان پر کچھ گواہ لائے جائیں گے۔ ان گواہوں میں سے فرشتے اور ہمارے اعضاء ہیں جیسے ہماری زبان، ہاتھ، کان اور آنکھیں بھی شامل ہوں گی۔
- ۲۔ ان سب سے بڑھ کر، خود خداوند عالم ہر چیز پر گواہ ہے۔
- ۳۔ یہاں بیان ہوا: ''خدا گواہ ہے ان اعمال پر جو ان سے چھپائے'' یعنی کچھ ایسے گناہ ہیں کہ جو خدا نے ان فرشتوں سے بھی چھپا لئے ہیں جو لوگوں کے اعمال کو درج کرنے پر مامور کئے گئے ہیں۔ خداوند عالم اپنی رحمت کی وجہ سے ان سے بھی چھپا لیتا ہے۔
- ۴۔ اس حصہ کے آخر میں حضرت امام علی علیہ السلام جو دُعا کرتے ہیں کہ خدا ان کو ہر نیکی اور احسان کے نزول میں حصہ دار بنا دے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولا کے حقیقی عزائم کیا تھے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہماری نیت ہمیشہ بہت وسیع ہونی چاہیے اور اسے کبھی محدود نہ کریں۔ چنانچہ اگر کسی شخص میں صرف ۱۰ لوگوں کی مدد کی طاقت یا اختیار ہو تو پھر بھی یہ تجویز کیا گیا ہے کہ بہت زیادہ لوگوں کی امداد کی نیت کرنی چاہی، حالانکہ وہ عملی طور پر ۱۰ سے زائد لوگوں کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔ مگر اسے اس نیت پر بھی ثواب اور اجر زیادہ ملے گا۔

✲✲✲✲✲

قسط:9

شیعہ اسلامی عقائد

{معادشناسی}

از: علامہ سیّد محمد حسین طباطبائیؒ

انسان، روح اور بدن سے بنا ہے

جولوگ اسلامی علوم سے کسی حد تک واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن وسنت میں روح وجسم یا نفس و بدن کے بارے میں بہت زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ جسم اور بدن کا تصور جو ادراک کے ذریعے محسوس ہوسکتا ہے، کسی حد تک سمجھنا آسان ہے اور روح یا نفس کا تصور مبہم اور پیچیدہ ہے۔

شیعہ اور سنی ماہرین علم کلام اور فلسفہ، روح کی حقیقت کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں، لیکن اس حد تک مسلم ہے کہ اسلامی نظریئے کے مطابق روح اور بدن دو مختلف اور ایک دوسرے سے الگ حقائق ہیں۔ موت کی وجہ سے بدن میں زندگی کی تمام خصوصیات ختم ہوجاتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ آخرکار یہ بدن ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ مگر روح ایسی نہیں ہے، بلکہ حقیقی زندگی میں موجود رہتی ہے اور جب تک روح بدن سے متعلق ہے، بدن بھی اس سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب روح بدن سے جدا ہوجاتی ہے اور بدن سے تعلق توڑ لیتی ہے (یعنی جب موت آجاتی ہے) تو بدن بے جان ہوجاتا ہے، لیکن روح اسی طرح اپنی زندگی جاری رکھتی ہے۔

جو کچھ قرآن مجید میں غور وخوض اور فکر وتدبر سے اور ایسے ہی آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے بیانات سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی روح ایک ایسا غیر معمولی مظہر ہے جو بدن کے ساتھ ایک قسم کی ہم بستگی

اور یگانگت رکھتا ہے۔ اللہ تعالی اپنی کتاب قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿١٤﴾﴾

تحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو نطفے میں تبدیل کر دیا ہے اور امن کی جگہ پر محفوظ رکھا۔ پھر نطفے کو منجمد خون کی شکل دے دی۔ اس کے بعد منجمد خون کو چبائے ہوئے گوشت کی شکل میں تبدیل کیا۔ پھر اس چبائے ہوئے گوشت کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسا موجود بنایا جس کی اس سے پہلے مثال نہ تھی۔ کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔[1]

واضح ہے مندرجہ بالا آیات فطرت کے مادی اور تدریجی ارتقا کو بیان کر رہی ہیں اور اس کے آخر میں جب روح یا شعور اور ارادے کی پیدائش کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں تو ایک اور فطرت کو بیان کرتی ہیں جو پہلی قسم کی پیدائش یا فطرت کے بالکل برعکس اور مخالف ہے۔

اسی طرح قرآن مجید ایک دوسری جگہ معاد کے منکروں کے جواب میں اس مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان موت کے بعد اور بدن کے ختم ہو جانے اور زمین کے اجزا میں گم ہو جانے کے بعد کس طرح دوبارہ زندہ ہوتا ہے اور پہلے انسان کی طرح ہو جاتا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾﴾

اے پیغمبرؐ! کہہ دیجئے کہ موت کا فرشتہ تمہیں تمہارے بدنوں سے الگ کر دیتا ہے، اور اس کے بعد تم اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جاتے ہو۔[2]

---

[1] سورۂ مومنون، آیت ۱۲۔ ۱۴۔

[2] سورۂ سجدہ، آیت ۱۱۔

یعنی یہ تمہارے بدن ہیں جو موت کے بعد ریزہ ریزہ ہوکر زمین کے اجزاء میں گم ہو جاتے ہیں، لیکن تمہاری روح جنہیں موت کے فرشتے نے تمہارے بدن سے نکالا ہے اور وہ ہمارے پاس محفوظ ہو۔

اس قسم کی آیات کے علاوہ قرآن مجید ایک جامع بیان کے ذریعے روح کو غیر مادی چیز کہتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

اے نبیؐ! (یہ لوگ) آپؐ سے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو کہہ دیجئے کہ روح خدا کا امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔[1]

قرآن مجید دوسری جگہ پر خدا کے امر کا یوں تعارف کراتا ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾

خدا کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو فرماتا ہے کہ: ہو جا! اور وہ چیز بن جاتی ہے۔[2]

مذکورہ آیات واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کائنات میں اشیاء کی پیدائش میں خدا کا فرمان تدریجی نہیں ہے اور نہ ہی یہ زمان و مکان کی حدود کی پابندی میں قید ہے۔ پس روح جو کہ خدا کے فرمان کی حقیقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، مادی نہیں ہو سکتی اور اپنے وجود میں مادیات کی خاصیت بھی نہیں رکھتی، کیونکہ مادیات کی خاصیت زمان و مکان کی زد میں بتدریج ارتقا حاصل کرتی ہے۔

دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث

عقلی تحقیق اور غور و فکر بھی روح کے بارے میں قرآن کریم کے نظریئے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہر انسان اپنے بارے میں ایک حقیقت کو سمجھتا ہے اور اسے ''میں'' کے لفظ میں بیان کرتا ہے۔ انسان میں

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۸۵۔

[2] سورۂ یٰس، آیت ۸۲۔

یہ ادراک ہمیشہ موجود ہے۔ حتی کہ کبھی کبھی اپنے سر، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضائے بدن کو یا پورے جسم کو بھول جاتا ہے، لیکن جب تک خود موجود ہے، اس ''میں'' کے ادراک سے باہر نہیں نکلتا۔ اس کی یہ خودی یا ''میں'' قابل تقسیم اور قابل تجزیہ بھی نہیں ہے۔ اگرچہ انسان کا بدن ہمیشہ تغیر وتبدل کا سفر طے کرتا ہوا ارتقا کی طرف گامزن رہتا ہے اور گوناگوں حالات وزمان اس پر گزرتے رہتے ہیں مگر مذکورہ بالا حقیقت (''میں'') ناقابل تغیر وتبدل رہتی ہے، لہٰذا واضح ہے کہ اگر یہ حقیقت مادی ہوتی تو لازمی طور پر مادیات کی خصوصیات یعنی زمان ومکان کے حوالے سے اس میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتیں۔

بدن ان تمام خواص کو قبول کر لیتا ہے اور روحانی تعلق اور ارتباط کی وجہ سے یہ خواص روح سے بھی منسوب کر دیئے جاتے ہیں، لیکن تھوڑی سی توجہ سے انسان پر واضح ہو جاتا ہے کہ ''اس وقت یا اُس وقت''، ''یہاں اور وہاں''، ''یہ شکل یا وہ شکل'' اور ''اِس طرف یا اُس طرف''، یہ تمام خواص بدن سے مخصوص ہیں اور روح ان خواص سے پاک اور بری ہے اور یہ تمام صفات بدن کی وجہ سے اس سے منسوب کی گئی ہیں۔

اس قسم کا بیان خاص کر ادراک وشعور (علم) میں جو کہ روح کے خواص میں سے ہے، ہمیشہ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اگر علم کی خاصیت مادی ہوتی تو مادہ کی خصوصیات یعنی تقسیم، تجزیے اور زمان ومکان کو قبول کر لیتا۔

البتہ اس عقلی بحث کا دامن بہت زیادہ وسیع ہے اور اس میں بے انتہا سوالات کئے جاسکتے ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔ یہاں پر اسی بیان کی حد تک اکتفا کیا جاتا ہے۔ مکمل بحث کیلئے اسلامی فلسفے کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

اسلام کی نظر میں، موت کی حقیقت

اگرچہ عام طور پر لوگ، انسان کی موت کو اس کی نابودی اور بربادی تصور کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو اسی چند روزہ زندگی تک محدود تصور کرتے ہیں جو پیدا ہونے اور مرجانے کے درمیان ہے، لیکن اسلام، موت کو ایک ایسا مرحلہ جانتا ہے جو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اسلام کے مطابق انسان ہمیشہ کی زندگی رکھتا ہے جس کیلئے کوئی خاتمہ موجود نہیں ہے اور موت جو کہ روح اور بدن کی جدائی ہے، اس کو زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیتی ہے اور اس مرحلے میں کامیابی اور ناکامی بھی نیکیوں اور بدیوں کی بنیاد ہوگی جو اس نے گزشتہ مرحلے میں انجام دی ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَا خُلِقْتُمْ لِلْفَنَآءِ بَلْ خُلِقْتُمْ لِلْبَقَاءِ وَإِنَّمَا تُنْقَلُونَ مِنْ دَارٍ إِلَى دَارٍ۔

تم فنا ہونے کیلئے پیدا نہیں کئے گئے ہو، بلکہ باقی رہنے کیلئے خلق ہوئے ہو۔

(موت کے ذریعے تم) ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جاؤ گے۔[1]

عالم برزخ

جیسا کہ کتاب وسنت سے مستفادہ ہوتا ہے، انسان، موت اور قیامت کے دوران ایک عام، محدود اور وقتی زندگی گزارتا ہے جس کو ''برزخ'' کہتے ہیں۔ یعنی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے درمیانی فاصلے کا نام ''برزخ'' ہے۔[2]

موت کے بعد انسان سے اس کے عقیدے اور نیک و بد اعمال کے بارے میں سوال و جواب ہوگا اور ایک اجمالی حساب کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوگا اس کے مطابق وہ شیریں اور اچھی یا ناگوار اور تلخ زندگی اس کو عطا ہوگی اور قیامت تک اسی میں رہے گا۔[3]

برزخ میں انسان کی زندگی اس انسان کے مشابہ ہوگی جو وقتی طور پر اپنے اعمال کی وجہ سے حوالات بھیج دیا گیا ہو اور اس کا مقدمہ ابھی عدالت کے سپرد نہ ہوا ہو اور اس سے مزید پوچھ گچھ اور تفتیش ابھی باقی ہو اور اس کا مقدمہ مکمل ہو جانے تک اس کو حوالات میں ہی رکھا گیا ہو، تا کہ مقدمے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت میں اس کے اعمال کی سزا دی جائے یا اس کو بری کر دیا جائے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۵۸، ص ۷۸۔

[2] بحار الانوار، ج ۲، باب البرزخ۔

[3] بحار الانوار، ج ۲، باب البرزخ۔

برزخ میں انسان کی روح بالکل اسی طرح ہوگی جیسے وہ دنیا میں زندگی گزارتا رہا ہو، اگر وہ نیک ہے تو اس کو نعمت، سعادت اور پاک لوگوں کی صحبت نصیب ہوگی اور اگر وہ برا انسان ہے تو اس کو عذاب ہوگا اور برے لوگوں کی صحبت نصیب ہوگی جن میں شیطان اور گم راہ لوگ شامل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل سعادت اور خوش نصیب لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾

(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے ہیں، انہیں مردہ شمار نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کو خدا کی طرف سے روزی ملتی ہے اور جو چیز خدا کے فضل و کرم سے ان کو ملتی ہے وہ اس پر خوش ہیں اور مومنین میں سے جو لوگ ان کی راہ پر چلتے ہیں اور ان تک ابھی نہیں پہنچ پائے ہیں ان کو بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں۔ ان کو بالکل خوف یا ڈر نہیں ہے، کہ نعمت اور فضل خدا (جس کی کوئی تعریف یا حد موجود نہیں ہے) ان کے شامل حال ہوگی اور یقیناً خداوند تبارک وتعالیٰ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔[1]

اور اسی طرح دوسرے گروہ کے بارے میں جو اپنی زندگی میں مال و دولت سے جائز فائدہ نہیں اٹھاتا یا اس کو برے کاموں پر صرف کرتا ہے، خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾

جب ان لوگوں میں سے ایک پر موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے: اے خدا! مجھے دوبارہ دنیا میں واپس لوٹا دے تا کہ شاید اپنے مال و دولت کو نیک راہ میں خرچ کر سکوں۔ یہ وہ کلام نہیں ہے جو وہ کہہ رہا ہے (یعنی اس کی باتوں کو نہیں سنا جائے گا) اور ایسے لوگوں کے درپیش ایک

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۹۔۱۷۱۔

برزخ ہے جس میں وہ قیامت تک موجود رہیں گے۔[1]

یعنی یہ لوگ قیامت تک برزخ کی زندگی گزاریں گے۔

روز قیامت، حشر ونشر

آسمانی اور الہامی کتابوں میں قرآن مجید ہی واحد کتاب ہے جس نے قیامت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ توریت میں اس دن کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہوا اور انجیل نے بہت ہی مختصر سا بیان قیامت کے متعلق دیا ہے۔ قرآن مجید نے سینکڑوں بار روز قیامت کے متعلق مختلف طریقوں اور ناموں سے اس دن کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس دن دنیا اور اہل دنیا کو کیا پیش آئے گا۔ بہرحال قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں کبھی اجمالی طور پر اور کبھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح کیا گیا کہ قیامت کے دن پر ایمان بھی خدا پر ایمان لانے کے مترادف ہے اور یہ اسلام کے تین بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے، لہٰذا جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اس کا انجام ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اگر خدا کی طرف سے حساب و کتاب اور صلہ و انعام نہ ہو تو دین کی تبلیغ اور دعوت جو خداوند تعالیٰ کے احکام کا مجموعہ ہے اور امر و نہی پر مشتمل ہے اس کا وجود کالعدم اور لغو ہو جائے گا۔ اس طرح نبوت و تبلیغ بھی ایک بے کار چیز دکھائی دے گی، بلکہ اس کا نہ ہونا، ہونے سے بہتر سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ دین کو قبول کر کے اور شرعی قوانین و اصول کی پیروی سے انسان ایک طرح کی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے اور اگر دین کی پیروی اور اطاعت کا کوئی فائدہ نہ ہو تو لوگ ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے نہیں دے سکتے۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ روز قیامت پر ایمان بہت ہی اہم عنصر ہے جو انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی طرف مائل کر کے ناپسندیدہ اخلاق اور کبیرہ گناہوں سے باز رکھتا ہے، جیسا کہ قیامت کو بھول جانا یا اس پر ایمان نہ رکھنا ہر گناہ اور خطا کی اصل بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب قرآن مجید

---

[1] سورۂ مومنون، آیت ۹۹۔۱۰۰۔

میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾

جولوگ خدا کے راستے سے ہٹ کر گمراہ ہوجاتے ہیں، ان کیلئے سخت عذاب ہے کیونکہ انہوں نے قیامت کے دن کو بھلا دیا ہے۔[1]

جیسا اوپر بیان کیا گیا روز قیامت کو بھول جانا ہی ہر گمراہی اور گناہ کی اصل بنیاد ہے۔

انسان اور کائنات کی پیدائش میں غور کرنے اور ایسے ہی آسمانی شریعتوں (احکام واصول) کی غرض وغایت کا جائزہ لینے کے بعد ایسے دن (قیامت) کا وجود واضح ہوجاتا ہے۔

جب ہم کائنات میں رونما ہونے والے حوادث وواقعات پر غور وخوض کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام بھی بغیر کسی غرض وغایت کے انجام نہیں پاتا اور اس کی اپنے مقصود ومطلوب سے ہٹ کر کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ ہر کام اسی اصلی مقصد کا مقدمہ ہوتا ہے حتی کہ وہ کام اور امور جو ظاہری طور پر بے مقصد شمار ہوتے ہیں مثلا قدرتی کام یا بچوں کے کھیل وغیرہ، اگر ان پر بھی غور کریں تو ان کاموں کے پیچھے بھی مناسب غرض وغایت کا مشاہدہ کریں گے۔ جیسا کہ قدرتی امور جو عام طور پر حرکت پر مشتمل ہیں، وہ جس مقصد کی طرف حرکت میں رہتے ہیں وہی ان کی غرض وغایت ہے اور بچوں کے کھیلوں میں بھی ان کھیلوں کے مناسب ایک تصوراتی مقصد موجود ہوتا ہے جو اس کھیل کی اصل بنیاد ہوتا ہے۔ جیسے جیت کا جذبہ وغیرہ۔

کائنات اور جہان کی پیدائش خدا کا کام ہے اور خداوند تعالیٰ بیہودہ اور بے مقصد کام انجام دینے سے پاک ہے۔ خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہے، روزی دیتا ہے اور پھر دوبارہ زندہ کرتا ہے، روزی دیتا ہے، مارتا ہے اور اسی طرح بناتا ہے اور پھر ختم کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کائنات سے اس کو کوئی فائدہ پہنچے یا ایک مستقل مقصد کو نظر میں رکھے۔

---

[1] سورۂ ص، آیت ۲۶۔

پس یقیناً دنیا اور انسان کی خلقت اور پیدائش کا ایک مستقل مقصد ہے۔ البتہ اس کا فائدہ یا منافع خدا کو نہیں پہنچتا کیونکہ خداوند تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور ہر فائدہ صرف مخلوق خدا کو ہی پہنچتا ہے۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ یہ دنیا اور انسان ایک مستقل چیز اور مکمل وجود کی طرف چل رہے ہیں جس میں زوال اور فنا موجود نہیں ہے اور جب دینی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی ہم انسانوں کے بارے میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رہنمائی اور دینی تعلیم کے اثر سے لوگ دو گروہوں یعنی نیکوکاروں اور بدکاروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ دنیا کی اس زندگی میں دونوں گروہوں میں بظاہر کوئی فرق و امتیاز موجود نہیں ہے، بلکہ بالکل الٹا، اکثر ترقی و کامیابی بدکاروں اور ظالموں کو ہی ملتی ہے اور نیکوکار لوگ ہمیشہ مصائب و مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ان کیلئے ہر قسم کی محرومیت اور مصیبت موجود ہوتی ہے۔

اس صورت میں عدل خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسری دنیا پیدا کرے جس میں دونوں گروہ اپنے عمل کی سزا اور جزا کو پہنچیں اور ہر گروہ اپنے اپنے حال کے مطابق زندگی گزارے۔ خداوند تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے، بیہودہ اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے اور یہ احتمال ان لوگوں کی عقل و خرد اور خیال سے بہت دور ہے جو خدا کے منکر ہو گئے ہیں، ان کافروں کے حال پر افسوس کہ ان کو آگ (دوزخ) کا وعدہ دیا گیا۔ آیا جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں ان کے ساتھ ان لوگوں کی طرح سلوک کیا جائے گا جو زمین میں تباہی اور بربادی پھیلاتے رہے؟ یا ہم پرہیزگاروں کو بھی فاسقوں اور برے لوگوں کی طرح رکھیں گے؟۔[1]

اور دوسری جگہ دونوں طریقوں اور دلیلوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ ص، آیت ۲۷۔۲۸۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

جولوگ جرم اور قتل وغارت گری کرتے ہیں کیا انہوں نے یہ سوچ لیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں؟ کیا ان دونوں کی موت اور زندگی برابر ہے؟ (اگر ایسا ہے تو) یہ لوگ اللہ کے بارے میں کتنا غلط سوچ رکھتے ہیں۔ خدا نے آسمانوں اور زمینوں کو برحق پیدا کیا ہے (نہ کہ بیہودہ) اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مقابلے میں سزا یا جزا ملے گی بغیر اس کے کہ کسی پر ذرا برابر بھی ظلم ہو۔[1]

ایک اور بیان

قرآن مجید کے ظاہر و باطن کے متعلق ہم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم میں اسلامی علوم و معارف کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے جو مجموعی طور پر ظاہر و باطن کے دو طریقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔

ظاہری طریقے کا بیان وہ بیان ہے جو عام فہم اور سادہ لوگوں کیلئے مناسب ہے اور اس کے برعکس باطنی طریقہ ہے جو خاص لوگوں سے متعلق ہے جسے معنوی اور روحانی ذریعے سے سمجھا جاتا ہے۔

وہ معانی جو ظاہری طریقے سے حاصل ہوتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کو اس کائنات کا مطلق حکمران اور فرمانروا بیان کرتے ہیں کہ تمام جہان اور کائنات اسی کی ملکیت ہے۔ خدا تعالیٰ نے بے شمار فرشتوں کو پیدا کیا ہے جو اس کے فرماں بردار اور اس کے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور اس کائنات کے چپے چپے میں پھیلاتے ہیں۔ کائنات کا ہر حصہ اور نظام فرشتوں کے ایک خاص گروہ سے متعلق ہے جو اس حصے یا نظام کی نگرانی کرتے ہیں۔

انسان بھی خدا کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں جن کی ذمہ داری خدا کے حکم کی اطاعت کرنا ہے اور

---

[1] سورۂ جاثیہ، آیت ۲۱۔ ۲۲۔

پیغمبرانِ الٰہی، خدا کے ان بیانات اور قوانین کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کو کیلئے بھیجے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کا نفاذ چاہتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اطاعت کیلئے سزا اور جزا کا وعدہ فرمایا ہے اور کفر و گناہ کیلئے عذاب وسزا کا وعدہ کیا ہے اور جیسا کہ خود اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ خداوند تعالیٰ عادل ہے اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری دنیا میں نیکوکاروں اور بدکاروں کے دو گروہ ایک جیسی زندگی سے بہرہ مند نہیں ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو آپس میں علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے یعنی اچھے لوگوں کو اچھی زندگی اور برے لوگوں کو بری زندگی ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل کے مطابق جو وعدہ فرمایا ہے، اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو کسی استثنا کے بغیر موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور ان کے ایمان واعتقادات اور اعمال کے بارے میں مکمل تفتیش کرے گا اور ان کے درمیان حقیقت اور حق پر مبنی فیصلے اور عدل کرے گا اور اس کے نتیجے میں ہر حقدار کو اس کا حق مل کر رہے گا۔ اس دن وہ ہر مظلوم کی فریاد سن کر ظالم سے اس کا حق لے گا اور ہر انسان کو اپنے ہر عمل کی پاداش ملے گی۔ انسانوں میں سے ایک جماعت دائمی بہشت میں اور دوسری جماعت دائمی دوزخ میں جائے گی۔

یہ قرآن کریم کا ظاہری بیان ہے جو کہ بالکل ٹھیک اور درست ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے جو انسان کی اجتماعی فکر کی پیداوار ہے۔ یہ اسی لئے تالیف اور مرتب کی گئی ہے تا کہ اس کا فائدہ عمومی تر اور اس کے عمل کا دائرہ وسیع تر ہو جائے۔

مگر جو لوگ حقائق کے دائرے میں قدم رکھتے ہیں اور قرآن مجید کی باطنی اور معنوی زبان سے ایک حد تک آشنا ہیں، ان بیانات سے ایسے مطالب اور حقائق کو سمجھتے ہیں جو عام فہم اور عام سطح فکر سے بہت ہی بالاتر ہیں۔ قرآن کریم بھی اپنے رواں اور سلیس بیانات کے اندر کبھی کبھی ایسے بیانات، مضامین وحقائق اور باطنی مقاصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قرآن کریم اپنے گوناگوں اشاروں کے ساتھ اجمالی طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ کائنات اپنے تمام

اجزا کے ساتھ کہ خود بھی انہی اجزا میں سے ایک ہے، اپنی ارتقائی حرکت میں (جو ہمیشہ کمال کی طرف جاری ہے) خدا کی طرف حرکت کر رہی ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ اپنی اس حرکت کو ختم کر کے خدا تعالیٰ کی عظمت وشوکت کے سامنے اپنے وجود کو بالکل کھو دے گی (یعنی اس کا وجود مٹ جائے گا)۔

انسان بھی اسی کائنات اور جہان کا ایک حصہ ہے اور اس کا خاص ارتقا علم، شعور کے ذریعے سے ہے اور بڑی تیزی سے خدا کی طرف بڑھ رہا ہے اور جس دن اس کی یہ حرکت آخری حد تک پہنچ جائے گی تو خدا کی وحدانیت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کیونکہ ہر کمال کی صفت اور قدرت صرف خدائے واحد کی مقدس ذات کے ہاتھ میں ہے اور اسی حقیقت کے ذریعے سے ہر چیز اپنی اصلی حالت میں اس کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

یہ ابدی جہان کی پہلی منزل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس دنیا میں اپنے نیک اعمال اور ایمان کے ذریعے خدا کے ساتھ رابطہ، تعلق، الفت، محبت اور ایسے ہی خدا کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے ساتھ تعلق رکھے تو اس کو بھی خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے پاس عالم بالا میں ایک خوش نصیب، سعادت سے معمور زندگی نصیب ہوگی جو ناقابل تعریف ہے اور اگر انسان اس فانی دنیا کی لذتوں کے ساتھ محبت کرے گا تو اس عالم بالا سے اپنا رشتہ اور تعلق توڑ کر خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں سے رشتہ محبت نہیں رکھے گا تو ایک دردناک عذاب اور ایک ابدی بدبختی میں گرفتار ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زندگی میں انسان کے نیک و برے اعمال وقتی اور عارضی ہیں اور جلد ہی ختم ہو جانے والے ہیں لیکن یہ نیک و بد اعمال انسان کے باطن میں قائم رہتے ہیں اور جہاں کہیں وہ جائے اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور یہی اعمال انسان کی آئندہ اچھی یا بری، شیریں یا تلخ زندگی کی بنیاد اور اس کا سرمایہ ہیں۔

گزشتہ مطالب کی تائید کیلئے مندرجہ ذیل آیات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ۝﴾

یقینی واپسی تیرے ربّ کی طرف ہے۔[1]

﴿اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۳﴾﴾

''خبردار تمام امور خدا کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔[2]

﴿وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿۱۹﴾﴾

آج کے دن تمام امور خدا کیلئے ہیں۔[3]

﴿یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿۲۷﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿۲۸﴾
فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿۲۹﴾ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾﴾

اے نفس جس نے آرام وسکون حاصل کیا ہے (خدا کی یاد سے) اپنے خدا کی
طرف واپس لوٹ جا، جبکہ تو راضی ہے اور خدا بھی تجھ سے راضی ہوگیا ہے۔ پس
میرے بندوں کی صف میں داخل ہوجا اور میری بہشت میں داخل ہوجا۔[4]

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب یوں ہوگا:

﴿لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ﴿۲۲﴾﴾

جن چیزوں کو آج تو دیکھ رہا ہے ان سے تو غافل رہا ہے، اب تیری آنکھوں سے ہم نے
پردے اٹھادیئے ہیں اور اس کے نتیجے میں آج تیری آنکھیں تیز بین ہوگئی ہیں۔[5]

قرآن کریم تاویل کے بارے میں جن حقائق سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے ان کے بارے میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ھَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِیۡلَہٗ ؕ یَوۡمَ یَاۡتِیۡ تَاۡوِیۡلُہٗ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ نَسُوۡہُ مِنۡ قَبۡلُ

---

[1] سورۂ علق، آیت ۸۔

[2] سورۂ شوریٰ، آیت ۵۳۔

[3] سورۂ انفطار، آیت ۱۹۔

[4] سورۂ فجر، آیت ۲۷۔۳۰۔

[5] سورۂ ق، آیت ۲۲۔

قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۵۳﴾

کیا یہ لوگ قرآن مجید کو نہیں مانتے کہ تاویل کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر ہیں؟ جس دن اس کی تاویل واضح ہو جائے گی اس وقت جو لوگ اس (قرآن) کو بھولے ہوئے ہیں وہ کہیں گے کہ ہمارے خدا کے پیغمبر حق پر تھے۔ پس کیا کوئی ہماری شفاعت کرنے والا ہے؟ یا یہ کہ ہم دنیا میں واپس لوٹا دیئے جائیں اور ان اعمال کے برعکس انجام دیں جو ہم پہلے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نفس (ذات) کو نقصان پہنچایا ہے، اور جو تہمت لگاتے تھے اس کو بھول گئے ہیں۔[1]

اور پھر فرماتا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ﴿۲۵﴾

اس دن خدا تعالیٰ ان کی حقیقی جزا اور پاداش دے گا اور وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک آشکار اور بے پردہ حقیقت ہے اور بس۔[2]

پھر فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴿۶﴾

اے انسان! تو بڑی مشکل اور مصیبت کے ساتھ اپنے خدا کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے، پس تو اس سے ضرور ملاقات کرے گا۔[3]

پھر فرماتا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ﴾

---

[1] سورۂ اعراف، آیت ۵۳۔

[2] سورۂ نور، آیت ۲۵۔

[3] سورۂ انشقاق، آیت ۶۔

جو شخص خدا سے ملاقات کا شائق اور امیدوار ہو (جان لے) کہ جو وقت خدا تعالیٰ نے ملاقات کیلئے مقرر کر رکھا ہے وہ وقت ضرور آئے گا۔[1]

پھر فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰﴾

پس جو شخص اپنے خدا سے ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال انجام دے اور خدا کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائے۔[2]

پھر فرماتا ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝۳۴ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝۳۵ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝۳۶ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝۳۷ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۳۸ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۳۹ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝۴۰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۴۱﴾

جس وقت سب سے بڑا حادثہ یا واقعہ (روز قیامت) رونما ہوگا، جس دن انسان اپنی تمام کوششوں کو یاد کرے گا اور جس دن وہ آگ جو عذاب کیلئے جلائی گئی ہے، سامنے آئے گی (تو لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے) پس جس شخص خدا کی سرکشی اور نافرمانی کی ہے اور اس نے دنیا کو اپنے لئے انتخاب کیا ہے، اس کا ٹھکانہ بھڑکتی آگ ہوگی اور جو شخص خدا کی نافرمانی سے ڈرا ہے اور اپنے نفس (اپنے آپ) کو دنیاوی خواہشات (ناپسندیدہ اور برے اعمال) سے بچائے رکھا ہے اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہوگا۔[3]

اور پھر اعمال کی سزا کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۷﴾

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۵۔

[2] سورۂ کہف، آیت ۱۱۰۔

[3] سورۂ نازعات، آیت ۳۴۔۴۱۔

اے لوگو جو کافر ہو گئے ہو، عذر اور بہانے نہ لاؤ، آج (روز قیامت) جو سزا تمہیں
دی جائے گی اس کی وجہ تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کو تم نے انجام دیا ہے۔[1]

عالم خلقت کا جاری رہنا

یہ جہان جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، بیکراں اور بے اندازہ عمر نہیں رکھتا (غیر فانی نہیں ہے) اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ جہان اور اہل جہان ختم ہو جائیں گے۔ قرآن مجید بھی اس مطلب کی تصدیق کرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى﴾[2]

ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سوائے حق اور معین وقت
کیلئے پیدا نہیں کیا ہے۔[2]

اب رہے یہ سوالات کہ کیا اس دنیا سے پہلے اور اس انسانی نسل سے پہلے کوئی اور جہان اور انسان وجود رکھتے تھے یا نہیں؟ یا موجودہ دنیا کی بساط لپیٹ دیئے جانے کے بعد کہ جس کی خبر قرآن نے دی ہے، کوئی نئی دنیا پیدا کی جائے گی اور انسانوں کو خلق کیا جائے گا؟، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا قرآن مجید میں کوئی واضح جواب تو موجود نہیں، البتہ کچھ اشارے موجود ہیں، جبکہ آئمہ اہل بیتؑ کی روایات میں ان سوالات کے مثبت جواب موجود ہیں۔[3]

(جاری ہے)

✲✲✲✲✲

---

[1] سورۂ تحریم، آیت ۷۔

[2] سورۂ احقاف، آیت ۳۔

[3] تفصیل کیلئے رجوع فرمائیں: بحارالانوار، ج ۱۴، ص ۹۷۔

ایمان وکفر

حجۃ الاسلام مولانا سیّد فدا حسین بخاری

لغت میں ''ایمان'' تصدیق کے معنی میں ہے اور کفر چھپانے کے معنی ہے۔ اس لحاظ سے کاشتکار، جو گندم کے بیج کو مٹی کے نیچے چھپاتا ہے اس کو بھی ''کافر'' کہتے ہیں۔

ایمان وکفر کی بحث کلامی موضوعات میں سے ایک اہم بحث ہے۔ علم کلام وعقائد کی اصطلاح میں ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، قیامت کے دن پر یقین اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اعتقاد ہے۔ البتہ حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے دائرے میں دیگر انبیائے عظام علیہم السلام، گزشتہ آسمانی کتابوں اور ان کی تعلیمات واحکام پر یقین بھی شامل ہے۔

ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝﴾

وہ ان تمام باتوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں (اے رسولؐ) ہم نے آپؐ پر نازل کیا اور جو آپؐ سے پہلے نازل کی گئی ہیں اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔[1]

ایمان کا مرکز

ایمان کا اصلی اور حقیقی مرکز انسان کا دل ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۴۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾

(اللہ نے) ان (صاحب ایمان لوگوں) کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے۔[1]

اور وہ لوگ جو زبان سے اقرار کرتے ہیں لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتے، بلکہ اسلام کی عظمت و طاقت کے سامنے (مجبوراً) ہتھیار ڈال دیتے ہیں، ان کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾

یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، کیونکہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔[2]

اظہارِ ایمان

ایک صاحب ایمان شخص کی شرط یہ ہے کہ وہ زبان یا کسی اور طریقے سے اس کا اظہار و اقرار کرے یا کم از کم اپنے یقین کا انکار نہ کرے، کیونکہ دوسری صورت میں اسے مومن نہ کہا جائے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ﴾

آیات خدا کو ان لوگوں نے یقین کے باوجود انکار کر دیا۔[3]

مذکورہ بیان سے کفر کی حدود واضح ہو جاتی ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص خدا کی وحدانیت، قیامت کے دن یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار کرے تو وہ کافر ہوگا۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ کے لائے ہوئے دین کے مسلمات میں سے کسی ایک کا انکار (جس سے واضح طور پر رسالت کا انکار لازم آتا ہو) بھی ارتکاب

---

[1] سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲۔

[2] سورۂ حجرات، آیت ۱۴۔

[3] سورۂ نمل، آیت ۱۴۔

کفر کا باعث ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت علی علیہ السلام کو قلعہ خیبر فتح کرنے کیلئے روانہ کیا تھا تو ان کے ہاتھ میں ایک پرچم دے کر فرمایا تھا: اس پرچم کو اٹھانے والا خیبر کو فتح کر کے ہی لوٹے گا۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے آنحضرتؐ سے مخاطب ہو کر سوال کیا تھا: یا رسول اللہؐ! ان کے ساتھ جنگ کی حد کیا ہے؟ تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قَاتِلْهُمْ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدْ مَنَعُوْا مِنْكَ دِمَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔

ان کے ساتھ تب تک جنگ جاری رکھو جب تک وہ خدا کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی نہیں دے دیتے۔ اگر انہوں نے یہ گواہی دے دی تو تمہارے لئے ان کا خون و مال محترم ہو جائے گا مگر یہ کہ انہیں کسی خون کے بدلے قتل کیا جائے اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔[1]

اس کے علاوہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ وہ کم از کم کیا چیز ہے جس کی بنا پر ایک بندہ، مومن کہلا سکتا ہے؟ تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ وَ يُقِرُّ بِالطَّاعَةِ وَ يَعْرِفُ اِمَامَ زَمَانِهٖ فَاِذَا فَعَلَ ذٰلِكَ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔

کم ترین درجہ ایمان یہ ہے کہ وحدانیت خدا اور رسالت حضرت محمد مصطفیؐ کی گواہی دے اور خدا کی اطاعت کا اقرار کرے اور اپنے زمانے کے امام کو پہچان لے۔ اگر ایسا کیا تو وہ مومن ہے۔[2]

---

[1] صحیح مسلم، باب فضائل علیؑ، ص ۱۷۔ بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۲۷۔

[2] بحار الانوار، ج ۶۶، ص ۱۶۔

کیا صرف شہادتین کے زبانی اقرار سے نجات ممکن ہے؟

اگرچہ ایمان کی حقیقت وہی دلی اعتقاد ہے، لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ایمان کی یہی مقدار انسان کی نجات کیلئے کافی ہے، بلکہ انسان کو چاہیے کہ ایمان کے آثار اور اس کی عملی ضروریات کا بھی پابند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی آیات اور احادیث میں حقیقی مومن اسے کہا گیا ہے کہ جو ایمان کے آثار اور الٰہی فرائض و واجبات کو انجام دینے کا پابند ہو۔ چنانچہ قرآن مجید نے سورۂ ''والعصر'' میں تمام انسانوں کو نقصان اٹھانے والوں میں شمار کیا ہے اور ان سے صرف ان لوگوں کو استثناء دیا گیا ہے جو ایمان کے ساتھ ساتھ، اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق و صبر کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾

قسم ہے زمانے کی! بے شک انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔[1]

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے کسی نے کہا کہ جو شخص اللہ کی توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آئے وہ مومن ہے، تو آپؑ نے پوچھا: تو پھر واجبات دینیہ کہاں جائیں گے؟ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ كَلَامًا لَمْ يَنْزِلْ فِيهِ صَوْمٌ وَلَا صَلٰوةٌ وَلَا حَلَالٌ وَلَا حَرَامٌ۔

اگر ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہوتا تو پھر نہ نماز و روزے کا حکم نازل ہوتا اور نہ کسی حلال و حرام کا کوئی وجود ہوتا۔[2]

---

[1] سورۂ عصر، آیت ۱۔ ۳۔

[2] الکافی، ج ۲، ص ۳۳۔

مذکورہ بیان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایمان کے مختلف درجات ہیں اور ہر درجہ ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ دلی اعتقاد کے ساتھ اس کا اظہار یا کم از کم عدم انکار، ایمان کا کم ترین درجہ ہے کہ دینی و دنیوی آثار کا ایک سلسلہ اس پر مرتب ہوتا ہے، جبکہ ایمان کا ایک اور درجہ جو انسان کیلئے دنیا و آخرت میں نجات کا سبب بنتا ہے، وہ ایمان کے عملی آثار کا پابند ہونا ہے۔

قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں دینی فرائض کے انجام کو بھی ارکان ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے اپنے آبا و اجداد سے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِیْمَانُ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ وَ عَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔

ایمان، معرفت قلبی، زبانی اقرار اور اعضاء و جوارح کے ذریعے اس پر عمل ہے۔[1]

بعض روایتوں میں شہادتین کے ساتھ ساتھ، کچھ اُمور جیسے نماز قائم کرنا، زکوٰۃ کی ادائیگی، فریضۂ حج کی انجام دہی اور ماہ رمضان کے روزوں کی پابندی کی قید بھی بیان ہوئی ہے۔ ایسی روایتیں اس بات پر ناظر ہیں کہ ان اعمال کے ذریعہ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان تمیز کی جا سکے یا یہ کہ شہادتین کا پڑھنا اسی صورت میں نجات بخش ہے جب اس کے ساتھ اعمال شرعی بھی انجام پائیں۔ ان اعمال میں نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ اہم اور سرفہرست ہیں۔

پس مذکورہ بیانات کی روشنی میں مسلمانوں کے کسی فرقہ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے فرقہ پر صرف اس لئے کہ وہ بعض فروع دین میں اس سے اختلاف رکھتا ہے، کفر کا حکم لگائیں۔

کفر کا معیار یہ ہے کہ انسان اصول سہ گانہ میں سے کسی ایک کا منکر ہو یا کسی ایسی چیز کا منکر ہو جو ان تین اصولوں (توحید، رسالت، قیامت) میں سے کسی ایک کے انکار کا لازمہ ہو اور یہ لازمہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ اس چیز کا حکم شرعی لحاظ سے اس قدر بدیہی اور ناقابل انکار ہو کہ اس کے انکار اور کسی ایک اصول کے اعتراف کو باہم جمع نہ کیا جا سکے۔

---

[1] امالی شیخ صدوقؒ، ص ۲۶۸۔

اس لحاظ سے تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ اسلامی برادری اور اخوت کی حفاظت کریں اور جو اختلافات اصول سے مربوط نہیں ہیں ان کو جھگڑے کا سبب یا ایک دوسرے کی تفسیق وتکفیر کا ذریعہ نہ بنائیں، بلکہ فکری اور اعتقادی اختلافات میں بھی علمی گفتگو اور تحقیق پر اکتفا کریں اور غیر منطقی تعصّبات، تحریفوں اور تہمتوں سے پرہیز کریں۔ اس لئے کہ تمام مسلمان اصول سہ گانہ (توحید، رسالت، قیامت) پر متفق ہیں، لہٰذا کسی فرقہ کو چند فروعی یا بعض اصولی مسائل پر اختلاف کی وجہ سے کسی دوسرے فرقے کے خلاف کفر کا حکم نہیں دینا چاہیے، کیونکہ بہت سے اختلافی اصول کلامی مسائل کا جز ہیں جو بعد میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان مورد بحث قرار پائے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے لئے دلائل رکھتا ہے، لہٰذا ایسے مسائل میں موجود اختلافات ہرگز اس امر کے سبب نہیں ہو سکتے کہ ایک دوسرے کے خلاف کفر وفسق کے فتوے جاری کریں اور اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کریں۔ باہمی اختلاف کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ غیر منطقی تعصّبات کو چھوڑ کر کھلے دل سے علمی گفتگو کی جائے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾

ایمان والو! جب تم راہ خدا میں سفر کرو تو (مومن وکافر) کی تحقیق میں دقت سے کام لو اور (خبردار) جو شخص (اظہار اسلام کیلئے) تمہیں سلام کرے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے اصول بیان کئے اور فرمایا کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ کسی دوسرے مسلماں کو کسی گناہ میں مرتکب ہونے کے سبب کافر یا مشرک کہے۔

تکفیری کون ہیں؟

تکفیری یعنی دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دینے والا یہ عنوان اس شخص یا گروہ پر صادق آتا ہے جو دوسرے مسلمانوں کو اپنے عقیدے کے ساتھ اتفاق نہ رکھنے کی وجہ سے کافر قرار دیتا ہے اور ان کے جان ومال کو حلال سمجھتا ہے۔

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۹۴۔

ایمان وعمل صالح کے آثار و برکات

۱۔ پاک زندگی:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

چاہے مرد ہو یا عورت جو بھی عمل صالح انجام دے گا بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے اعمال کی بہترین جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔[1]

۲۔ مومن کی ہر (نیک) کوشش کا اجر:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ﴾

جو شخص عمل صالح انجام دے گا اور مومن بھی ہوگا اس کی کوشش برباد نہیں ہوگی۔[2]

۳۔ رحمت الٰہی کا مستحق:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ﴾

مومنین میں سے عمل صالح انجام دینے والوں کو ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔[3]

۴۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

جو لوگ ایمان اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، خدائے رحمٰن ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔[4]

---

[1] سورۂ نحل، آیت ۹۷۔

[2] سورۂ انبیاء، آیت ۹۴۔

[3] سورۂ جاثیہ، آیت ۳۰۔

[4] سورۂ مریم، آیت ۹۶۔

۵۔کامیابی:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾﴾

بے شک وہی اہل ایمان کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں خضوع وخشوع رکھتے ہیں۔[1]

۶۔خدا کے بہترین بندے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ؕ﴿۷﴾﴾

بے شک اہل ایمان اور نیک عمل کرنے والے خدا کے بہترین خلائق ہیں۔[2]

احادیث کی روشنی میں ایمان کی پہچان

۱۔اخلاص:

اَلْاِیْمَانُ اِخْلَاصُ الْعَمَلِ۔

عمل خالص، ایمان کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔[3]

۲۔توکل:

لَا یُصَدَّقُ اِیْمَانُ عَبْدٍ حَتّٰی یَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ اَوْثَقَ مِنْهُ بِمَا فِیْ یَدِهٖ۔

بندے کا ایمان کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ کہ جو کچھ خدا کے اختیار میں ہے اس پر اپنے ہاتھ میں رہنے والی چیز سے زیادہ بھروسہ کرے۔[4]

۳۔ایمان کا عمل کے بغیر ہونا:

لَا یُقْبَلُ اِیْمَانٌ بِلَا عَمَلٍ وَّ لَا عَمَلٌ بِلَا اِیْمَانٍ۔

---

[1] سورۂ مومنون، آیت ۱۔۲۔

[2] سورۂ بینہ، آیت ۷۔

[3] غرر الحکم، فرمان نمبر ۸۷۳۔

[4] بحار الانوار، ج ۱۰۰، ص ۳۷۔

ایمان عمل کے بغیر اور عمل ایمان کے بغیر قابل قبول نہیں ہے۔[1]

۴۔قلبی ایمان:

اَلْاِیْمَانُ عَقْدٌ بِالْقَلْبِ وَ قَوْلٌ بِاللِّسَانِ وَ عَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔

قلبی عقیدے، زبان کی شہادت اور اعضاء وجوارح کے ذریعہ عمل کو ایمان کہتے ہیں۔[2]

۵۔بہترین ایمان:

اَفْضَلُ الْاِیْمَانِ اَنْ تَعْلَمَ اَنَّ اللّٰہَ مَعَکَ حَیْثُمَا کُنْتَ۔

بہترین ایمان یہ ہے کہ یہ جان لو کہ تم جہاں بھی رہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔[3]

ایمان کے درجے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے عبدالعزیز قراطیسی کو ایمان کے درجات بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یَا عَبْدَ الْعَزِیْزِ! اِنَّ الْاِیْمَانَ عَشْرُ دَرَجَاتٍ بِمَنْزِلَةِ السُّلَّمِ یُصْعَدُ مِنْهُ مِرْقَاةٌ بَعْدَ مِرْقَاةٍ. فَلَا یَقُوْلَنَّ صَاحِبُ الْاِثْنَیْنِ لِصَاحِبِ الْوَاحِدِ لَسْتَ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی یَنْتَهِیَ اِلَی الْعَاشِرِ فَلَا تُسْقِطْ مَنْ هُوَ دُوْنَکَ فَیُسْقِطَکَ مَنْ هُوَ فَوْقَکَ وَ اِذَا رَاَیْتَ مَنْ هُوَ اَسْفَلُ مِنْکَ بِدَرَجَةٍ فَارْفَعْهُ اِلَیْکَ بِرِفْقٍ وَ لَا تَحْمِلَنَّ عَلَیْهِ مَا لَا یُطِیْقُ فَتَکْسِرَهٗ فَاِنَّ مَنْ کَسَرَ مُؤْمِنًا فَعَلَیْهِ جَبْرُهٗ۔

ایمان کے دس درجے ہیں جیسے سیڑھی کے ایک زینے سے دوسرے زینے تک انسان مرحلہ بہ مرحلہ اوپر جاتا ہے۔پس جس کے پاس ایمان کے دو درجے ہیں وہ ایک درجے والے سے یہ نہ کہے کہ تمہارے پاس ایمان ہی نہیں ہے، یہاں تک کہ ایمان دسویں درجے تک پہنچ جاتا ہے۔پس جو شخص تجھ سے کمتر درجہ رکھتا ہے، اسے ایمان سے خارج

---

[1] نہج الفصاحہ، ص ۶۸۴۔

[2] تحف العقول، ص ۵۷۔

[3] نہج الفصاحہ، ص ۲۲۹۔

مت کرو، کیونکہ تم سے اوپر والا تمہیں خارج کر دے گا۔ پس اگر دیکھو کہ کوئی تم سے کمتر درجہ رکھتا ہے تو نرمی اور ملائمت سے اسے اوپر لانے کی کوشش کرو۔ خبردار! اس پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو اس کے ایمان میں خلل پڑ جائے گا جس کی تلافی بھی تیرے ذمے ہوگی۔[1]

ایمان سے خارج ہونے کا سبب

اَدْنٰی مَا یَخْرُجُ بِهِ الرَّجُلُ مِنَ الْاِیْمَانِ اَنْ یُّوَاخِیَ الرَّجُلَ عَلٰی دِیْنِهٖ فَیُحْصِیَ عَلَیْهِ عَثَرَاتِهٖ وَ زَلَّاتِهٖ لِیُعَنِّفَهٗ بِهَا یَوْمًا مَّا۔

وہ معمولی چیز جس کے باعث انسان ایمان سے خارج ہو جاتا ہے یہ ہے کہ انسان اپنے ایمانی بھائی کی کھوج میں لگا رہے کہ اسے اس کی کوئی غلطی مل جائے جس کے سبب ایک دن اس کی سرزنش اور ملامت کرے۔[2]

*****

شخصیت ساز صفات

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

ثَلَاثَةٌ تَدُلُّ عَلٰی کَرَمِ الْمَرْءِ: حُسْنُ الْخُلُقِ وَ کَظْمُ الْغَیْظِ وَ غَضُّ الطَّرْفِ۔

تین چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو کریم اور بزرگوار بنا دیتی ہیں: خوش اخلاقی، غصے پر قابو پانا اور آنکھوں کو حرام سے بچانا۔

(تحف العقول، ص ۳۱۹)

---

[1] الکافی، ج ۲، ص ۴۵۔

[2] معانی الاخبار، ص ۳۹۴۔

اخلاق نبوی کی رفعتیں

حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

اور آپؐ بلند ترین اخلاق کے درجہ پر ہیں۔

آنحضرت گرامی ﷺ کی حیات مقدسہ کا یہ حصہ آپؐ کی تمام زندگی بلکہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی حیات سے ممتاز ہے۔ایک دفعہ حضرت عائشہؓ سے ہشام بن عامرؓ نے رسول اکرم ﷺ کے اخلاق کریمہ سے متعلق سوال کیا تو بی بی نے جواب دیا:

اَلَسْتَ تَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ؟ فَاِنَّ خُلُقَ رَسُوْلِ اللهِ كَانَ الْقُرْاٰنُ۔

کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ قرآن دراصل رسول اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ کا مجموعہ ہی تو ہے۔[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کی اس صفت کو مندرجہ بالا آیہ مجیدہ میں نہایت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ''اے حبیبؐ! آپؐ اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں''۔حضور اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ اور خلق عظیم کی گواہی ذات ذوالجلال نے دی ہے۔اگر آج اکیسویں صدی کے نکتہ چین آ کر مختلف حربے استعمال کریں اور الزام تراشیاں کریں جس طرح صدر اسلام میں کفار و مشرکین کیا کرتے تھے اور آج کے پڑھے لکھے جاہل اگر کارٹون بنا کر گستاخی کریں یا بکے ہوئے لکھاری چند کتابیں لکھ کر جسارت کریں تو آنحضرت ﷺ کی شان میں ذرا برابر فرق نہیں آنے والا ہے۔اس لئے کہ آپؐ کی

---

[1] شرح ابوداؤد، ج ۵، ص ۲۴۷، حدیث ۱۳۱۲۔

رحمت و بزرگی اپنے بیگانوں کے ہاں مسلم ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

آپؐ اللہ کی عنایت سے ان پر نرمی کے ساتھ پیش آتے ہو۔ اگر آپؐ میں کج خلقی اور سخت دلی ہوتی تو یہ لوگ آپؐ سے دور ہٹ جاتے۔[1]

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾﴾

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی سے متعلق ہمیشہ بے تاب رہتا ہے۔ وہ اہل ایمان پر بہت نرم اور نہایت مہربان ہے۔[2]

آپؐ کے اخلاق کریمہ کی جامعیت

یاد رہے اخلاق کا تعلق فقط تواضع و انکساری کے ساتھ ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور حیات کی ہر تہہ میں شامل ہے۔ دوست و دشمن، خلوت و جلوت، صلح و جنگ، لیل و نہار، بزرگ و خورد، عزیز و بیگانہ، سبھی تک دائرہ اخلاق کی نمایاں حیثیت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اخلاقیات ان سبھی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا. اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَآئِبِ الْحَقِّ۔

بخدا اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی غمگین نہیں کرے گا، آپؐ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹۔

[2] سورۂ توبہ، آیت ۱۲۸۔

قرضہ ادا کرتے ہیں، غریبوں کی اعانت اور مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت اور مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں۔[1]

حضرت ابوسعید خدریؓ آپؐ کے اعلیٰ اخلاقی پہلوؤں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وَكَانَ خَفِيْفَ الْمَؤُنَةِ، كَرِيْمَ الطَّبِيْعَةِ، جَمِيْلَ الْمُعَاشَرَةِ، طَلْقَ الْوَجْهِ، بَسَّامًا مِّنْ غَيْرِ ضَحِكٍ، مَحْزُوْنًا مِّنْ غَيْرِ عُبُوْسٍ، مُتَوَاضِعًا مِّنْ غَيْرِ مَذَلَّةٍ، جَوَادًا مِّنْ غَيْرِ سَرَفٍ، رَقِيْقَ الْقَلْبِ، رَحِيْمًا بِكُلِّ مُسْلِمٍ۔

آنحضرتؐ کی زندگی کے اخراجات بہت معمولی تھے، آپؐ مہربان طبیعت کے مالک، لوگوں کے ساتھ اچھے انداز کے ساتھ پیش آنے والے، خوش رُو، قہقہہ کے بجائے ہمیشہ لبوں پر تبسم سجائے ہوئے، حالت حزن میں چہرے پر بل نہ ڈالنے والے، باوقار تواضع کرنے والے، فضول خرچی سے پاک سخاوت کے مالک، نرم دل اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت مہربان تھے۔[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ (ص) يَقْسِمُ لَحَظَاتِهِ بَيْنَ اَصْحَابِهِ فَيَنْظُرُ اِلٰى ذَا وَ يَنْظُرُ اِلٰى ذَا بِالسَّوِيَّةِ. قَالَ: وَلَمْ يَبْسُطْ رَسُوْلُ اللهِ (ص) رِجْلَيْهِ بَيْنَ اَصْحَابِهِ قَطُّ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان لحظات کو تقسیم کرتے ہوئے برابر نگاہ فرمایا کرتے تھے اور کبھی اپنے پاؤں اصحاب کے سامنے دراز نہیں فرمایا کرتے تھے۔[3]

جناب ابی درداءؓ کا کہنا ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ (ص) اِذَا حَدَّثَ بِحَدِيْثٍ تَبَسَّمَ فِيْ حَدِيْثِهِ۔

جب آپؐ گفتگو فرماتے تو اس دوران آپؐ کے چہرے پر تبسم سجا رہتا۔

---

[1] صحیح البخاری، ج ۱، ص ۳، حدیث ۳۔

[2] سنن النبیؐ، ص ۴۱۔

[3] الکافی، ج ۲، ص ۶۷۱۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ لَقَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ (ص) يُدَاعِبُ الرَّجُلَ يُرِيْدُ اَنْ يَسُرَّهُ۔

آپؐ گفتگو کے دوران مسکراتے تھے تا کہ لوگ خوش رہیں۔[1]

روایات میں ملتا ہے کہ ایک شخص حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اخلاقی پہلو بیان فرمائیں۔ آپؑ نے فرمایا: تم اللہ کی سب نعمتوں کو شمار کرو تو میں بھی آپؐ کی تمام اخلاقیات کو بیان کروں؟ اس نے کہا: اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں کرسکتا، کیونکہ ارشاد الٰہی ہے: ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ایسا نہیں کرسکتے''۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری نعمتوں کو قلیل شمار کیا ہے[2]، جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کو عظیم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ''اے پیغمبرؐ! آپؐ اخلاق کے عظیم و اعلیٰ درجہ پر ہیں''۔ جب انسان قلیل نعمتوں کا شمار نہیں کرسکتا تو میں آپؐ کی عظیم الشان عظمتوں کو کیونکر شمار کرسکتا ہوں۔ بس اتنا جان لو کہ تمام انبیائے عظام علیہم السلام کا اخلاق حسنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف ایک پسندیدہ اخلاقی صفت کا مظہر ہے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے ساری اخلاقیات کو ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر دیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے خداوند عالم نے اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کیلئے مبعوث فرمایا ہے''۔[3]

کردار کی طاقت

ایک دفعہ ایک دیہاتی عربی مدینے آیا اور سیدھا مسجد نبوی میں پہنچا۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ زر و جواہر مانگنے کی غرض سے مدینہ آیا تھا۔ جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوا تو آپؐ اپنے بہت سے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اس نے اپنی حاجت کا اظہار کیا اور آپؐ کو کچھ عطا کرنے کو کہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کوئی چیز دی، لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ اسے وہ بہت کم محسوس ہوئی۔ اس پر اس نے آپؐ کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کئے اور آپؐ کی شان میں گستاخی کی۔ صحابۂ کرامؓ یہ منظر دیکھ

---

[1] الکافی، ج ۲، ص ۶۶۳۔

[2] ارشاد ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾: ''کہہ دیجئے کہ دنیا کا سرمایہ تو (بہت ہی) قلیل ہے''۔ (سورۂ نساء، آیت ۷۷)

[3] وقائع الایام، ج ۳، ص ۲۵۔

کر آگ بگولا ہو گئے اور قریب تھا کہ پکڑ کر اس کی خبر لیتے، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عربی کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور کچھ اور چیزیں اس کو عطا فرمائیں۔ اس عربی نے بغور دیکھ لیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے عام رؤساء جن کو اب تک اس نے دیکھا ہے، سے بالکل مختلف ہیں اور آپؐ کے پاس زر و جواہر کے کوئی ذخیرے نہیں ہیں۔ عربی آپؐ کی عطا پر راضی ہو گیا اور اس کی زبان پر تشکر کے الفاظ جاری ہو گئے۔ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری کل کی نامناسب باتوں کی وجہ سے میرے اصحابؓ کو تم پر غصہ آ گیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، اس لئے اگر ہو سکے تو اپنے یہی الفاظ ان کے سامنے بھی دہرا دو تا کہ ان کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے''۔ عربی نے کہا: مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگلے دن وہی عربی مسجد نبوی میں آیا۔ صحابۂ کرامؓ بھی جمع تھے۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''یہ شخص کہہ رہا ہے کہ اب یہ مجھ سے راضی ہے، کیا ایسا ہی ہے؟'' عربی نے کہا: جی بالکل! اور پھر اس نے وہی تشکر آمیز الفاظ دہرائے جو گزشتہ روز آپؐ کی خدمت میں عرض کر چکا تھا۔ اس پر صحابۂ کرامؓ کے چہروں پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ ہنسنے لگے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''میری اور اس طرح کے شخص کی مثال بالکل اس شخص کی مانند ہے جس کا اونٹ بدک گیا ہو اور لوگ اس کی مدد کی غرض سے مل کر اس اونٹ کے پیچھے دوڑ پڑیں تو وہ اونٹ مزید بدک جائے۔ اس پر اونٹ کے مالک نے لوگوں سے کہا: خدارا! میرے اونٹ کو چھوڑ دو! میں خوب جانتا ہوں کہ اسے کس طرح رام کیا جائے۔ پھر جیسے ہی لوگ وہاں سے ہٹے تو وہ شخص ہاتھ میں کچھ گھاس لے کر آرام آرام سے آگے بڑھا اور بغیر کوئی شور و غل کئے آہستہ آہستہ گھاس دکھاتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا اور اس کی مہار کو پکڑ کر اپنے راستے پر روانہ ہو گیا۔ اگر میں کل اس کی جسارت پر تمہیں آزاد چھوڑ دیتا تو یہ بے چارہ عرب دیہاتی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور کفر اور بت پرستی جیسی بڑی ہی بری حالت میں مارا جاتا، لیکن میں نے تمہیں روک دیا اور خود ہی نرمی اور ملائمت سے اسے رام کر لیا''۔[1]

---

[1] داستان راستان، شہید مطہری، ص ۳۷۔۳۸۔

اخلاق نبوی بزبان امام علیؑ

حضرت امام علی علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات حسنہ کو یوں بیان فرماتے ہیں:

آپؐ خندہ جبین، نرم طبیعت اور مہربان طبع کے مالک تھے کوئی برا کلمہ زبان سے جاری نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی بات آپ کو پسند نہیں ہوتی تھی تو اس سے اغماض فرمایا کرتے۔ کسی آس رکھنے والے کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ جب دوسرے بات کرتے تو آپؐ خاموشی سے سنا کرتے تھے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب تک بات کرنے والا خود خاموش نہ ہوتا آپؐ اس کی بات کو درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ آپؐ بہت زیادہ فیاض، نہایت صادق، نہایت نرم طبع اور بہت زیادہ خوش معاشرت تھے۔[1]

آپؐ کا معمول تھا کہ ملتے وقت پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے۔ اگر کوئی آپؐ کے سلام میں پہل کرتا تو سلام میں اضافہ کے ساتھ جواب دیتے۔ اگر کوئی ''السلام علیکم'' کہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''علیکم السلام ورحمۃ اللہ'' کہہ کے جواب دیتے اور اگر کوئی ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''علیکم السلام و رحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہہ کے جواب دیتے تھے۔[2]

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ قَرَنَ اللهُ بِهٖ مِنْ لَّدُنْ اَنْ كَانَ فَطِيْمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِّنْ مَّلٰٓئِكَتِهٖ يَسْلُكُ بِهٖ طَرِيْقَ الْمَكَارِمِ وَمَحَاسِنَ اَخْلَاقِ الْعَالَمِ لَيْلَهٗ وَنَهَارَهٗ۔

اللہ نے آپؐ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت فرشتے (روح القدس) کو آپؐ کے ساتھ لگا دیا تھا جو انہیں شب و روز بزرگ خصلتوں اور پاکیزہ سیرتوں کی راہ پر لے چلتا تھا۔[3]

---

[1] سنن ترمذی، حلیہ مبارک کے بیان کے ذیل میں۔

[2] مستدرک الوسائل، ج ۸، ص ۳۶۷۔

[3] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۲۔

دوسروں سے آپؐ کا برتاؤ

آپؐ اپنے امور اور کاموں میں مداومت کیا کرتے اور جس کام کیلئے وقت مقرر فرماتے کبھی اس سے سرمو بھی اختلاف نہیں کرتے تھے۔ اپنے معاملات میں نہایت دیانت دار اور حسن معاملہ کو نگاہ میں رکھتے۔ تالیف قلوب کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کا ترازو کسی طرف جھکنے نہیں دیتے۔ جود وسخا آپؐ کی نشاۃ ثانیہ اور فطرت تھی۔ ساری زندگی کسی کے سوال پر ''نہیں'' کا لفظ نہیں نکلا اور یہی فرمایا کرتے تھے:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّخَازِنٌ، وَاللّٰہُ یُعْطِیْ۔

میں تو صرف تقسیم کرنے والا اور خزانہ دار ہوں اور دینے والی اللہ کی ذات ہے۔[1]

آپؐ کی ذات مقدسہ میں ایثار وقربانی ہر صفت کے ساتھ نمایاں نظر آتی تھی۔ خود فاقوں میں رہتے اور دوسروں کو عطا کیا کرتے تھے۔ مہمانوں کی بذات خود خاطر داری اور تواضع فرماتے تھے۔ فیاضی میں مسلمان و کافر کا امتیاز نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک خانہ نبوی سے فیض یاب ہوتا تھا۔ مہمان نوازی میں کسی کے ساتھ تفریق نہیں کرتے تھے اور آپؐ کا ابر کرم ہر وقت برستا رہتا تھا اور فیاضی خاص و عام تک یکساں تھی۔ آپ ﷺ دوسروں کو تحائف بھیجتے اور دوسروں کے تحفے بھی قبول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے کہ ہدایا اور تحفے محبت میں اضافے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

تَھَادَوْا تَحَابُّوْا۔

ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو تا کہ تم میں باہم محبت بڑھے۔[2]

آپؐ ہمسائیوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحائف بھیجا کرتے تھے۔

سادگی اور بے تکلفی

سادگی اور بے تکلفی آپؐ کا معمول تھا۔ کھانے، پینے، اوڑھنے اور پہننے میں تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ لباس کے معاملے میں زرق برق اور نمود ونمائش کو ناپسند اور سادگی کو بے حد پسند فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] صحیح البخاری، ج ۱، ص ۵۷، حدیث ۷۱۔

[2] السنن الکبریٰ، بیہقی، ج ۶، ۱۶۹، حدیث ۱۲۲۹۷۔

رہبانیت اور بے جا روحانیت کی نفی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہبانیت کے مخالف تھے۔ آپ کا فرمان تھا کہ: لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ[1]: ''اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہیں''۔ جائز دنیاوی نعمتوں سے استفادہ کرتے تھے، تاہم عیش وعشرت سے باز رہنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ مساوات آپ کا شعار تھا۔ امیر وغریب، آقا وغلام، عربی وعجمی، کالا وگورا سبھی آپؐ کی نگاہ میں برابر تھے۔ مسلمانوں کو برابری سے بھی بڑھ کر اخوت وبرادری کا درس دیا۔ برابری میں پھر مقابلہ ہوسکتا ہے مگر برادری میں ایثار وقربانی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

تواضع وانکساری

تواضع وانکساری آپؐ کا معمول زندگی تھا۔ آپؐ بنفس نفیس گھر کے کام کرتے، بازار سے سودا سلف لاتے، جوتے کو خود پیوند لگاتے، غریبوں مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے، غریب سے غریب بھی بیمار ہوتا تو عیادت کیلئے جاتے[2]۔ آپؐ اپنے کام خود انجام دیا کرتے تھے۔[3]

عزم واستقلال اور شجاعت

آپؐ عزم واستقلال کا مظہر تھے۔ عرب کے کفرستان اور شرکستان میں اس طرح دعوت حق کو پھیلانا آپؐ کے عزم وحوصلے کا بہترین مظہر ہے جس سے مخالفین کی تمام قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ سینکڑوں مصائب اور بیسیوں معرکے ہوئے مگر پامردی اور ثبات قدم میں ذرا برابر لغزش نہ آئی، بلکہ جب غزوات اور گھمسان کی جنگ میں مجاہدین اسلام کے قدم ڈگمگاتے تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے۔ جنگ کے دوران کوئی مشرک آپؐ کے زیادہ قریب نہ آتا تھا۔[4]

---

[1] دعائم الاسلام، ج ۲، ص ۱۹۳۔

[2] مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۴۸۔

[3] شرح شفائے قاضی، ج ۲، ص ۱۱۶۔

[4] مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۴۶۔

صداقت ووفا

صداقت وامانت آپؐ کی وہ مشہور ومعروف صفت ہے جسے آپؐ کی ذات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آپ کا جزو لاینفک تھی۔ غیر مسلم بھی آپ کو صادق وامین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

آپؐ کے ایفائے عہد کا دشمن بھی اعتراف کرتا ہے اور سب کو تاکید فرماتے تھے کہ دوست ودشمن، مسلمان وغیر مسلمان کسی سے وعدہ خلافی نہیں ہونی چاہیے، جس سے وعدہ کرو اپنے عہد کا پاس رکھو۔

عفوودرگزر

عفوودرگزر کی تاکید فرماتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کفار ومشرکین نے آپؐ پر الزام تراشیاں کیں، قتل کی دھمکی دی، راستے میں کانٹے بچھائے، اوجڑی پھینکی، آپؐ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ جادوگر، شاعر، مجنوں کہا مگر آپؐ نے کسی سے انتقام نہیں لیا اور سب کو برابر دعوت دیتے رہے کہ کلمۂ توحید کہو تو نجات پا جاؤ گے۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ اور فتح حرم کا دن تھا جب بعض صحابہ کرام نے کہا کہ اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَۃِ: ''آج کے دن گردنیں اڑیں گے''۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَۃِ: ''آج کا دن رحم کا دن میں ہے''۔ آپؐ نے طرح طرح کی اذیتیں دینے والوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا:

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ اذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔

آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔[1]

خلق عظیم میں دوست ودشمن کی بات نہ تھی بلکہ ابر رحمت سبھی پر برس رہا ہوتا تھا۔ امیر وغریب، عزیز وبیگانہ کی تمیز نہ تھی، بلکہ آنحضرتؐ کی سیرت سب کیلئے یکساں تھی۔ دشمنوں کو نہ فقط معاف کر دیتے تھے بلکہ ان کی ہدایت کیلئے دُعا بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہجرت سے پہلے کے واقعات کو نقل کرنے کیلئے بھی سخت دل کی ضرورت ہے۔ اس وقت جب ایک صحابی نے عرض کی: یارسول اللہ! آپؐ دشمنوں کو بددُعا کیجئے تو فرمایا کہ مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اغیار کیلئے بھی دُعا فرمایا کرتے تھے:

---

[1] فیض القدیر، ج ۵، ص ۱۷۱، حدیث ۶۸۳۶۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ. فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

معبود! میری قوم کو ہدایت فرمادے کہ یہ جانتے نہیں ہیں۔[1]

سفر طائف میں آپؐ کو اتنے پتھر مارے گئے کہ پورا جسم لہولہان ہے مگر آپؐ کی زبان اقدس پر یہ جملے ہیں: اے اللہ! اہل طائف کو اسلام نصیب کردے۔

بچوں سے پیار و شفقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں پر بہت زیادہ مہربان اور ان سے نہایت شفقت کرتے تھے۔ راستے میں بچے مل جاتے تو انہیں سلام کیا کرتے تھے۔ نماز جماعت کے دوران اگر کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی تو آپؐ نماز کو مختصر کردیتے تھے[2]۔ واضح رہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت فقط مسلمان بچوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ غیر مسلم کے بچوں پر بھی لطف کیا کرتے تھے۔ آپؐ بچوں کو چومتے اور انہیں پیار کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بدوی نے کہا: آپؐ بچوں کو اتنا پیار کرتے ہیں میرے تو دس بچے ہیں مگر میں نے آج تک انہیں پیار نہیں کیا تو فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں۔

خواتین کا احترام

بانی اسلام نے مستورات کے ساتھ برتاؤ میں ان کی عزت و منزلت کو اجاگر کیا۔ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کے حقوق کی دادرسی کی ہے اور انہیں عزت و احتشام اور تعظیم و وقار سے سرفراز کیا ہے۔ اسلام نے قرار دیا کہ عورت ماں کی صورت میں ہو تو جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے، بیٹی کی صورت میں تو والدین کیلئے باعث رحمت بنتی ہے اور بیوی کی حیثیت سے ہو تو شوہر کیلئے نصف ایمان کا سبب بنتی ہے۔

---

[1] تنزیہ الانبیاء، ج ۱، ص ۸۲۔

[2] بخاری شریف، کتاب صلوٰۃ۔

حاصل کلام

آنحضرت ﷺ کی سیرت مقدسہ اور اخلاق حسنہ کو دیکھنے کے بعد ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور اس وقت انسانوں میں اور بالخصوص مسلمانوں میں کتنی زبوں حالی ہے۔ دوسرے پیچھے رہ جائیں تو رہیں مگر ہمارے پاس تو اسوۂ کامل موجود ہے، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں وہ بے دین بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ انسانوں کے گلے کاٹ کر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ بے گناہوں کا خون کر کے، معصوم بچوں کو سکولز میں قتل کر کے، عبادت گاہوں پہ حملہ کر کر کے۔۔۔ اسلام کے مقدسات کو مٹا رہے ہیں۔ یہ دراصل اسلام اور بانی اسلام کے دشمن ہیں جن کا اصل کام اسلام کی اقدار کو دہشت گردی کا رنگ دینا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ اسلام اور دہشت گردی کو ایک جیسا بنا دیا جائے۔ اسلام دشمن عناصر پہلے سے اس تاک میں بیٹھے ہیں کہ نظام اسلام کو مخدوش کر دیا جائے اور دنیا کو یہ باور کرا دیا جائے کہ اسلام میں انسانوں کی نجات اور حیات کا مکمل نظام نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظام ناکام ہو چکے ہیں۔ کمیونزم کا خاتمہ ہو گیا اور سوشلزم ختم ہو گیا۔ استبدادی نظام ہو یا آمرانہ سسٹم، یا اب سرمایہ داری نظام ہو، یہ سارے نظام فیل ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد ساری دشمنی کا رخ اسلام کی طرف مڑ گیا ہے۔ کچھ اس قسم کے گروہ تیار کئے گئے جو اسلام کے نام پر اسلام کو بدنام کریں جن کا کام انتہا پسندی اور دہشت گردی کو پھیلانا ہے، تاکہ اغیار کے مذموم عزائم کو کامیاب بنایا جا سکے۔

ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد و وحدت کو فروغ دیں۔ اپنے جزوی اختلافات کو ختم کر کے مشترکات پر توجہ دیں۔ ان تمام حربوں کا واحد حل کلمۂ توحید کے ساتھ توحید الکلمہ کا نفاذ ہے۔ پروردگار عالم ہمیں محسن انسانیت اور بانی اسلام ﷺ کی سیرت طیبہ اور اخلاق حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب فرمائے۔ الٰہی آمین!

✲✲✲✲✲

ولی عہدی امام رضا علیہ السلام کا مسئلہ [1]

دوسرا اور آخری حصہ

استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہریؒ

ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس اہم تاریخی موضوع پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ جرجی زیدان اور کچھ دیگر مؤرخین نے کھلے لفظوں میں کہا ہے کہ بنوعباس کی سیاست کا محور نیکیوں کو چھپانا اور حقائق کو دبانا تھا۔ اس وجہ سے تاریخ میں سے کچھ چیزیں ایسی بھی رہ گئی ہیں کہ جن کے بارے میں آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ولی عہدی کی بات حضرت امام رضا علیہ السلام کی جانب سے شروع نہیں ہوئی۔ امام رضا علیہ السلام نے ولی عہد بننے کی نہ خواہش ظاہر کی اور نہ آپؑ دلی طور پر مامون کا نائب و خلیفہ بننا چاہتے تھے اور نہ ہی یہ چیز امام وقت کے شایان شان تھی۔ دراصل شروع ہی سے اس مسئلہ کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا۔ مامون خراسان میں تھا۔ تاجکستان کے کچھ علاقے اس وقت خراسان میں شامل تھے۔ مامون وہاں سے اپنے چند سپاہیوں کو امام رضا علیہ السلام اور بنی ہاشم کے کچھ دیگر افراد کو خراسان بلانے کیلئے مدینہ روانہ کرتا ہے۔ آپ کو ان راستوں، شہروں، علاقوں اور دیہاتوں سے گزار کر لایا گیا کہ جہاں آپ کے ماننے اور جاننے والے موجود نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں امام رضا علیہ السلام کو پولیس کے کڑے پہرے میں قید کر کے لایا جا رہا تھا۔ جب آپ ''مرو'' پہنچے تو آپ کو ایک الگ مکان میں لایا گیا۔ مامون اور امام علیہ السلام کے مابین پہلی جو گفتگو تھی وہ یہ تھی کہ میں آپ کو خلافت کی باگ دوڑ دینا چاہتا ہوں۔ پھر کہا کہ اگر آپ یہ قبول نہ فرمائیں تو ولی عہدی کا منصب ضرور

---

[1] اقتباس از کتاب ''سیرتِ آل محمدؐ''، استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ۔ بشکریہ از: (http://shiastudies.net)۔

قبول کریں۔آپ نے سخت انکار کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ امام علیہ السلام کے انکار کی وجہ کیا ہے؟اس سلسلے میں ہم روایات کی طرف چلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں وہ کونسی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے امام علیہ السلام کو انکار کرنا پڑا؟

عیون اخبار الرضاؑ میں ذکر ہوا ہے کہ مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے کہا: میں سوچ رہا ہوں کہ مسند خلافت چھوڑ کر اسے آپؑ کے حوالے کروں اور آپؑ کی بیعت کرلوں۔امام علیہ السلام نے فرمایا: تم خلافت کے مستحق ہو کہ نہیں؟اگر تم اس کے حقدار ہو اور یہ خلافت الٰہی ہے تو تم اس لباس کو کسی اور کے حوالے کرنے کے مجاز نہیں ہو جسے اللہ تعالیٰ نے تمہیں نصیب کیا ہے، اور اگر تم اس کے حقدار نہیں ہو تب بھی تم اسے کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتے، کیونکہ جو چیز تمہاری نہیں ہے اس کو تم کسی اور کے حوالے کیسے کر سکتے ہو۔اس سے امامؑ کی مراد یہ تھی کہ اگر خلافت تمہارا حق نہیں ہے تو یزید کے بیٹے معاویہ کی طرح اعلان کرو کہ میں اس کا حقدار نہیں ہوں، میرے آبا و اجداد نے غلطی سے مجبوراً عنان حکومت میرے ہاتھ میں دی ہے۔ اس لئے کہ معاویہ بن یزید نے کہا تھا کہ میرے باپ دادا نے خلافت غصب کر کے اس پر ناجائز طور پر قبضہ جمایا تھا اور میں جامہ خلافت کو اتار کر واپس جا رہا ہوں۔اگر تم بھی خلافت دینا چاہتے ہو تو اسی طرح کرو۔سب سے پہلے تمہیں اپنے آبا و اجداد اور ان کے انداز حکومت کو ناجائز اور غلط کہنا ہوگا۔مامون نے جب یہ بات سنی تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور گفتگو کو بدلتے ہوئے کہا اچھا چھوڑیئے اس بات کو، شاید آپ کی کوئی مجبوری ہے۔پھر مامون نے کہا کہ آپ کو ہماری شوریٰ میں شرکت تو کرنا پڑے گی۔

مامون ایک پڑھا لکھا شخص تھا۔حدیث، تاریخ، فلسفہ اور ادبیات پر اسے مکمل عبور حاصل تھا۔ طب و نجوم میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔آپ اسے وقت کا قابل ترین شخص بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاید سلاطین وخلفاء میں مامون جیسا قابل اور لائق شخص پیدا ہی نہیں ہوا ہو۔چنانچہ اس نے دلیل کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ آپؑ کے دادا حضرت علی علیہ السلام نے بھی شوریٰ میں شمولیت اختیار کی تھی؟

اس وقت کی شوریٰ میں چھ آدمی تھے۔فیصلہ اکثریت کے پاس تھا۔اس وقت کسی نے دھمکی دی تھی کہ اگر شوریٰ کے فیصلے سے کسی نے انکار کیا تو ابوطلحہ انصاری اس کا سر قلم کر دے گا۔یہ صورت حال بھی اس

جیسی ہے۔لہٰذا آپ اپنے دادا علی علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کو قبول کریں۔

ایک لحاظ سے مامون امام علیہ السلام کو سمجھانے کی ایک لاحاصل کوشش کر رہا تھا کہ آپؑ کے دادا علی علیہ السلام نے خلافت کو اپنا حق جانتے ہوئے بھی شوریٰ کے فیصلوں کو تسلیم کیا، حالانکہ علی علیہ السلام کو اس وقت احتجاج کرنا چاہیے تھا اور آپ شوریٰ میں شامل ہی نہ ہوتے اور اس وقت تک اپنا احتجاج جاری رکھتے جب تک کہ ان کو اپنا حق نہ مل جاتا، لیکن آپؑ نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی مرضی سے ہی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی اور اپنی خوشی سے خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیا۔لہٰذا اب بھی وہی صورت حال ہے بہتر یہ ہوگا کہ آپ ہماری شوریٰ میں آجائیں، لیکن آپؑ کی خاموشی اور انکار کے بعد اس نے دھمکی آمیز رویہ اپناتے ہوئے امام علیہ السلام کو ولی عہد بننے پر مجبور کیا۔

یہ نظریہ قطعی طور پر درست نہیں ہے کہ امام علیہ السلام نے ڈر اور خوف کی وجہ سے ولی عہدی کا منصب قبول کیا ہے۔دراصل یہ سب کچھ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کیلئے کیا گیا۔ دوسرا آپ نے امامت کی ذمہ داریاں بھی دوسرے امام کی طرف منتقل کرنا تھیں۔اس کے علاوہ اور بھی شرعی ذمہ داریاں تھیں جن کو امامؑ نے نبھانا تھا۔اگر تاریخی حقائق کو دیکھا جائے تو یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ آپؑ نے مامون کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔آپؑ کا ایک بار کا ٹھکرانا اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ مامون کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے نہ اس کی کسی قسم کی مدد کرنے کو تیار تھے۔مگر مصلحت کی بنا پر آپ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے اس پر شرط عائد کی کہ میں خلافت اور حکومت کے کاموں میں مداخلت نہیں کروں گا۔اس صورت میں مجھے نائب خلیفہ مقرر کرنا ہے تو کرلو۔میرے نام پر سکہ جاری کرنا ہے تو کرلو۔میرا نام استعمال کرتے ہوئے خطبہ پڑھنا ہے تو پڑھ لو، لیکن عملی طور پر مجھے اس سے دور رکھو گے۔میں نہ عدالتی اور حکومتی امور میں دخل اندازی کروں گا اور نہ کسی کو مقرر اور معطل کرنے میں حصہ لوں گا۔اس کے علاوہ آپؑ نے حکومت کا سرکاری پروٹوکول بھی قبول نہ کیا۔اس لحاظ سے آپؑ اس کو سمجھا رہے تھے کہ وہ اس کی حکومت کے خیر خواہ نہیں ہیں اور نہ ہی اس خلافت کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایک روز مامون نے ملک کے سرکردہ افراد اور سیاسی و مذہبی شخصیات کو مدعو کیا۔سب کو سبز لباس پہننے

کی تلقین کی گئی۔[1]

پس وقت مقررہ پر سب شرکاء پہنچ گئے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے امام علیہ السلام کی ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی۔ سب سے پہلے مامون کے بیٹے عباس نے امام علیہ السلام کی بیعت کی۔ اس سے قبل وہ اپنے باپ کا ولی عہد تھا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگ آتے رہے اور بیعت کرتے رہے۔ پھر شعراء اور خطباء کی باری آئی۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں انتہائی خوبصورت اشعار کہہ کے محفل کو پر کیف بنا دیا۔ اس کے بعد امام علیہ السلام کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ آپؑ اپنی نشست سے اٹھ کر سٹیج پر تشریف لائے اور صرف ڈیڑھ سطر پڑھ کر اپنی تقریر مکمل کر لی۔ آپؑ نے فرمایا: ہم (اہلبیت اطہارؑ) تم لوگوں پر حق رکھتے ہیں کہ تمہارے سربراہ مقرر ہوں۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں کہ مامون ہمارے حوالے کرے۔ پھر فرمایا: تمہارا بھی ہمارے اوپر ایک حق ہے۔ تمہارا ہمارے اوپر حق یہ ہے کہ ہم تم سب کے حقوق کی حفاظت کریں اور تم پر حکومت کریں۔ جب تم نے ہمارا حق ادا کر دیا یعنی اپنی باگ ڈور ہمارے سپرد کر دی تو ہم پر لازم ہے کہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھائیں۔ والسلام۔[2]

اس مختصر خطاب میں آپؑ نے مامون کا نام تک نہ لیا اور نہ ہی اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح محسوس ہو رہا تھا کہ جس طرح آپؑ مامون کی ولی عہدی کے خلاف بول رہے ہوں۔ پھر آپؑ نے عملی طور پر بھی ایسا کر دکھایا۔ مامون کے حکومتی امور میں مداخلت نہ کی اور نہ کسی قسم کا شاہی اعزاز لیا۔

ایک دفعہ مامون نے آپؑ سے درخواست کی کہ آپؑ نماز عید میں سرکاری طور پر شرکت فرمائیں،

---

[1] کہا جاتا ہے کہ فضل بن سہل نے سبز لباس تجویز کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عباسیوں کا پسندیدہ رنگ کالا تھا۔ فضل نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سبز لباس پہن کر کانفرنس میں شرکت کریں۔ کہا جاتا ہے یہ رنگ مجوسیوں کا پسندیدہ رنگ تھا، لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ بات کسی حد تک سچی ہے۔

[2] بحار الانوار میں اس مختصر تقریر کی یہ عبارت درج ہے: لَنَا عَلَيْكُمْ حَقٌّ بِرَسُوْلِ اللهِ (ص) وَ لَكُمْ عَلَيْنَا حَقٌّ بِهٖ. فَاِذَا اَنْتُمْ اَدَّيْتُمْ اِلَيْنَا ذٰلِكَ وَجَبَ عَلَيْنَا الْحَقُّ لَكُمْ: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہمارا تم پر ایک حق ہے اور تمہارا بھی ہم پر ایک حق ہے۔ جب تم اپنا حق ادا کر دو گے تو ہم پر تمہارا حق ادا کرنا واجب ہو جائے گا''۔ (بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۴۶)

لیکن آپؑ نے اس سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا میرا تم سے معاہدہ نہیں ہوا کہ میں حکومتی امور میں مداخلت نہ کروں گا۔ مگر جب اس نے اصرار کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میں اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ اپنے جدّ بزرگوار کی سنت پر عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلوں گا۔ مامون نے امام علیہ السلام کی شرط قبول کر لی۔ چنانچہ امام علیہ السلام جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں اور پورے شہر میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے تو مامون نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے امام علیہ السلام کو واپس گھر بھجوا دیا۔

ان شواہد سے یہ ثابت ہو گیا کہ ولی عہدی کا منصب قبول کرنا امام علیہ السلام کی مرضی کے خلاف تھا اور آپؑ کو زبردستی اس کا اقرار کرنے پر مجبور کیا گیا جس پر آپؑ نے مصلحت کے تحت اس منصب کو قبول تو کر لیا لیکن حکومت کے کسی مسئلہ میں مداخلت نہ کی اور نہ ہی کسی لحاظ سے شریک اقتدار ہوئے۔ آپؑ نے اس انداز سے کنارہ کشی کی کہ دشمن کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ آپؑ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ حق و باطل اور شب و روز ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔

مشکوک مسائل

اب تک ہم نے جن مسائل کا تذکرہ کیا ہے وہ بظاہر مشکوک نظر آتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔ پھر علماء و مؤرخین کا بھی آپس میں اختلاف ہے کہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ مامون امام علیہ السلام کو مدینہ سے ''مَرو'' بلائے اور اپنے خاندان کو نظر انداز کر کے خلافت آل محمدؐ کے سپرد کر دے؟ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا فضل بن سہل کے مشورے سے ہوا ہے۔

بعض مؤرخین نے اس کو فضل کا تجویز کردہ منصوبہ قرار دیا ہے۔ مگر یہ قول انتہائی کمزور ہے، جرجی زیدان اور ایڈورڈ براؤن جیسے عیسائی مؤرخین نے امامؑ کی ولی عہدی کے مشورے کو فضل کی تجویز تسلیم کیا ہے۔ ان کہنا ہے کہ فضل بن سہل شیعہ تھا اور وہ دل و جان سے خلافت کو آل محمد علیہم السلام کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

اگر یہ قول صحیح ہوتا تو پھر امام رضا علیہ السلام کو فضل کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ خلافت کو اولاد علیؑ کے سپرد کئے جانے کے حالات مکمل سازگار تھے۔ اس صورت میں امام علیہ السلام کو قطعی طور

پر یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں یہ عہدہ قبول نہیں کروں گا، جس پر آپؑ کو جان سے مار دینے کی دھمکی کیوں دی جارہی تھی۔ اگر ایسی صورت میں آپؑ نے ولی عہدی قبول کر لی تھی تو کھل کر حکومتی امور میں مداخلت کرتے اور مامون کو عملی طور پر خلافت سے الگ کر دیتے۔

البتہ یہاں پر ایک اور اعتراض بھی اٹھتا ہے کہ اگر امام علیہ السلام اور فضل بن سہل ایک دوسرے کے تعاون سے مامون سے خلافت لے بھی لیتے تو کیا حالات قابو میں آجاتے؟ خراسان اسلامی مملکت کا ایک جز تھا۔ ''رَی'' سے دوسری جانب عراق جو سابق دارالخلافہ تھا اور حجاز، یمن، مصر اور شام وغیرہ کے حالات کو کیسے قابو میں لایا جاسکتا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں کے خیالات اور حالات اہل ایران سے قطعی مختلف تھے، بلکہ ان ملکوں کے لوگ ایرانیوں کے زبردست مخالف تھے۔ بالفرض اگر امام رضا علیہ السلام خراسان کے حاکم ہوتے اور بغداد میں کوئی اور مدمقابل ہوتا اور امام کی ولی عہدی کی خبر بغداد تک پہنچتی اور بنی عباس کو اس کا پتا چلتا تو وہ مامون کو معزول کر کے ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ اس وقت بہت بڑا انقلاب برپا ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ ضرور اس بات پر سیخ پا ہوتے کہ ہم نے ایک سو سال کی محنت کے بعد اور بے تحاشہ تکلیفیں اٹھا کر اقتدار حاصل کیا ہے، اب اتنی آسانی سے خلافت کو علویوں کے حوالے کیسے کر دیں۔ بغداد میں احتجاج کا بازار گرم ہو جاتا اور گردونواح کے لوگ بھی امام علیہ السلام کی مخالفت میں متحد ہو سکتے تھے۔

یہ بات بھی حقیقت سے بہت دور ہے اور اس کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا جاسکتا کہ فضل بن سہل شیعہ ہونے کی بناء پر امام علیہ السلام کو مسند خلافت پر لانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ولی عہدی کا مسئلہ اس کا تجویز کردہ نہیں تھا۔ دوسرا اس کا شیعہ ہونا بھی شک و تردید سے خالی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ احتمال زیادہ قوی ہے کہ فضل بن سہل جو کہ کچھ عرصہ پہلے ہی مسلمان ہوا تھا، دراصل ایران کو اسلام سے پہلے والا ایران بنانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابھی ایرانی اس کے منصوبے سے اتفاق نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ وہ پکے مسلمان بن چکے ہیں اور اگر انہیں اسلام کے خلاف اٹھنے کا کہا جائے گا تو مخالفت کریں گے۔ اس لئے اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے یہ منصوبہ بنایا کہ ایک ایسی شخصیت کے

ذریعے عباسی خلیفہ کو خلافت سے برخاست کر دیا جائے جسے مسلمانوں میں زبردست عزت و مرتبہ حاصل ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ وقتی طور پر خلافت امام رضا علیہ السلام کو دے دے گا اور پھر امام رضا علیہ السلام کو بیرونی طور پر بنی العباس سے الجھا دے گا اور اندرونی طور پر خود شورش پیدا کر کے ایران کو دوبارہ مجوسیت کے دور میں تبدیل کر دے گا۔

اگر یہ فرض درست ہے تو امام علیہ السلام کیلئے ایک بڑے خطرے کو دور کرنے کیلئے مامون کا ساتھ دینا ضروری تھا۔ اس لئے کہ فضل بن سہل اسلام کیلئے مامون سے کہیں بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ مامون جیسا بھی تھا مگر ایک مسلمان خلیفہ تھا۔

ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تمام خلفاء ایک جیسے نہ تھے۔ یزید اور مامون میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مامون ایک تو پڑھا لکھا، دانشور اور علم دوست خلیفہ تھا۔ وہ کئی لحاظ سے نسبتاً ایک اچھا حاکم اور بہتر سیاستدان تھا۔ اس نے جو فلاحی و رفاہی کام کئے شاید ہی کسی اور عباسی خلیفہ نے کئے ہوں؟ آج جو علمی و اسلامی ترقی مسلم قوموں میں موجود ہے، اس میں ہارون و مامون کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ یہ روشن فکر اور جدید سوچ رکھنے والے حکمران تھے۔ آج بہت سے اسلامی کارنامے ان دونوں سلاطین کے مرہون احسان ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اقتدار کیلئے یہ لوگ اپنے بیٹے کو بھی قتل کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ہارون نے ایک دفعہ اپنے اسی بیٹے مامون کو کہا تھا کہ ''اَلْمُلْکُ عَقِیْمٌ'' یعنی اقتدار میں کوئی رشتہ داری نہیں ہوتی۔ اگر تو بھی میرے اقتدار کیلئے خطرہ بن جائے تو تجھے قتل کرا دوں گا۔ ہارون حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو برحق امام سمجھتا تھا مگر اس نے خود انہیں زہر دے کر شہید کروایا۔

بہرحال اگر حقیقت حال ایسی ہو جیسا کہ ہم نے بیان کی ہے کہ ولی عہدی کا مسئلہ فضل کا تجویز کردہ ہو تو یہ امام علیہ السلام اور تمام مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ تھا، کیونکہ فضل بن سہل کی نیت درست نہ تھی۔ ہماری شیعہ روایات کے مطابق حضرت امام رضا علیہ السلام فضل بن سہل سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جب فضل اور مامون کے مابین اختلاف ہو جاتا تو امام علیہ السلام مامون کی حمایت کرتے تھے۔ روایات میں ہے کہ فضل اور ہشام بن ابراہیم حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ

خلافت تو آپؑ کا حق ہے یہ سب غاصب ہیں۔ آپؑ اگر ساتھ دیں تو ہم مامون کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد آپؑ باقاعدہ طور پر خلیفہ ہو جائیں گے۔ حضرتؑ نے ان دونوں کی اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا جس سے انہوں نے سمجھا کہ انہوں نے ایسی بات کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں فوراً مامون کے پاس آئے اور کہا کہ ہم امام علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کا امتحان لینے کیلئے ہم نے ان سے کہا کہ آپؑ اگر ہمارا ساتھ دیں تو ہم مامون کو قتل کر سکتے ہیں، لیکن امام علیہ السلام نے انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؑ کے ساتھ مخلص ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب مامون کی امام سے ملاقات ہوئی تو مامون نے فضل اور ہشام کی بات امام علیہ السلام کو بتلائی تو امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ دونوں جھوٹ کہتے ہیں۔ یہ واقعی تمہارے دشمن ہیں۔ اس کے بعد آپؑ نے مامون سے فرمایا: ان دونوں سے احتیاط کیا کرو، یہ کسی وقت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بہت سی روایات کے مطابق حضرت علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام مامون کی نسبت فضل بن سہل سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے تھے۔

ان حقائق کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی عہدی کی تجویز فضل ہی کی تھی۔ یہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ اس نے اسلام کا نام لے کر بہت بڑا فائدہ حاصل کیا اور ترقی کرتے کرتے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر پہنچ گیا۔ امام علیہ السلام اس شخص کی اس تجویز کو قطعی طور پر اچھا نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ آپؑ کو اس کی نیت پر شک نہیں بلکہ اس بات کا یقین تھا کہ فضل اسلام اور امام علیہ السلام کا نام استعمال کر کے ایران کو صدیوں پیچھے کی طرف دھکیلنا چاہتا ہے۔

الغرض یہاں تک ہم نے یہ بحث کی ہے کہ اگر ولی عہدی فضل کی تجویز تھی اور وہ واقعی شیعہ تھا جیسا کہ بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ہے تو ایسی صورت میں امام رضا علیہ السلام کو مامون کے خلاف فضل کی مکمل حمایت کرنی چاہیے تھی اور اگر فضل کا مقصد ایران کو مجوسیت کی طرف واپس دھکیلنا تھا تو اس صورت میں آپؑ کو مامون کی حمایت کرنی چاہیے تھی تاکہ ان اسلام دشمنوں کا منصوبہ ناکام بنایا جاتا۔ اس پر ہم نے بتایا کہ ہماری روایات زیادہ تر اسی دوسرے احتمال کی تائید کرتی ہیں۔ امام علیہ السلام شروع ہی سے فضل کو ایک مفاد پرست اور سازشی انسان سمجھتے تھے۔

ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ ولی عہدی کی تجویز فضل کی نہیں بلکہ مامون کی اپنی تھی۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مامون نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کی نیت اچھی تھی یا بری؟ اگر اس کی نیت اچھی تھی تو کیا اپنے اس فیصلے پر برقرار رہا یا فیصلہ بدل لیا؟ اگر یہ کہیں کہ وہ حسن نیت رکھتا تھا اور آخر تک اسی پر قائم رہا تو یہ بات بالکل ہی قابل قبول نہیں ہے۔ یہ نکتہ کسی حد تک درست ہوسکتا ہے کہ وہ شروع میں تو مخلص تھا لیکن بعد میں بدل گیا۔

شیخ مفیدؒ اور شیخ صدوقؒ کا نظریہ بھی یہی تھا۔ جناب شیخ صدوقؒ اپنی مشہور کتاب عیون اخبار الرضا میں لکھتے ہیں کہ مامون شروع میں امام کی ولی عہدی کے بارے میں اچھی نیت رکھتا تھا، کیونکہ اس نے واقعی طور پر منت مانی تھی۔ وہ اپنے بھائی امین کے ساتھ جنگ میں الجھ گیا تھا۔ اس نے منت مانی تھی کہ اگر خدا نے اس کو اس کے بھائی امین پر فتح اور غلبہ دیا تو وہ خلافت کو اس کے حقدار کے سپرد کردے گا۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے بھی اس کی پیشکش کو اس لئے ٹھکرا دیا کہ آپؑ کو علم تھا اس کا یہ فیصلہ جذباتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شخص اپنے تمام ارادے اور قسمیں توڑ ڈالے گا۔

مگر کچھ مؤرخین نے یہ لکھا ہے کہ وہ شروع ہی سے اچھی نیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ اس کی ایک سیاسی چال تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی سیاسی چال کیا تھی؟ کیا وہ امام علیہ السلام کے ذریعہ سے علویوں کی تحریک کو کچلنا چاہتا تھا؟ یا امام رضا علیہ السلام کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے امام علیہ السلام ایک گوشہ میں خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور مامون کے اقدامات سے راضی نہیں تھے۔ اس لئے اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ حضرتؑ کو حکومت میں شامل کر کے تنقید کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ جیسا کہ عام طور پر تمام سیاستدان کرتے ہیں کہ اپنے مخالفوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کی عوامی مقبولیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایک طرف انہیں کوئی عہدہ دیتے ہیں اور دوسری طرف سے اس کے کاموں میں رخنہ اندازی کر کے اسے ناکام بناتے ہیں تاکہ اس کے طرفدار اس سے بدبین اور مایوس ہو کر علیحدہ ہو جائیں۔ روایات میں یہ بات ملتی ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ایک مرتبہ مامون سے کہا تھا: میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم مجھے حکومت میں شامل کر کے میری روحانی ساکھ خراب کرنا چاہتے ہو۔ یہ سن کر مامون غصے میں آ گیا اور اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور

بولا: یہ آپؑ کیسی باتیں کرتے ہیں، اس قسم کی باتیں مجھ سے منسوب کیوں کرتے ہیں؟

مذکورہ مفروضوں کا تحقیقی جائزہ

مذکورہ مفروضوں میں سے ایک مفروضہ کی بنا پر حضرت امام رضا علیہ السلام کو دلی طور پر اس عہدے کو قبول کر لینا چاہیے تھا۔ یعنی وہ مفروضہ کہ ولی عہدی کی تجویز دراصل فضل بن سہل کی تھی جو کہ شیعہ تھا۔ اس مفروضے کی بنا پر امام رضاؑ پر یہ اعتراض نہیں ہے کہ آپؑ نے ولی عہدی کا عہدہ کیوں قبول کیا بلکہ اس بنا پر اصل اعتراض یہ ہے کہ آپؑ نے اس عہدے کو سنجیدگی سے کیوں نہ قبول کیا۔ مگر اسی بات سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حقیقت حال اس طرح سے نہ تھی۔ ہم اگر شیعہ ہونے سے ہٹ کر ایک غیر جانبدار شخص کے طور پر اس کا جائزہ لیں تو دو صورتیں سامنے آتی ہیں: حضرت امام رضا علیہ السلام دیندار شخص تھے یا دنیا دار؟ اگر دیندار تھے تو جب آپؑ یہ دیکھ رہے تھے کہ اس عہدے کی وجہ سے خلافت کو بنی عباس سے نکال کر اولاد علیؑ میں منتقل کیا جا سکتا ہے تو آپؑ کو فضل کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا چاہیے تھا اور اگر آپؑ دنیادار انسان تھے تو تب بھی آپؑ کو اس کی ہر ممکن مدد کرنی چاہیے تھی۔ مگر آپؑ نے ایسا نہیں کیا اور اس عہدے کو دل سے قبول نہیں کیا اور یہی چیز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔

اور اگر یہ مفروضہ درست ہو کہ فضل اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا تو امام علیہ السلام کا اقدام بالکل صحیح تھا، کیونکہ حضرتؑ نے دوسرے اشخاص میں سے اس شخص کو چنا جس میں نسبتاً کم برائی تھی۔ یعنی ایک طرف مجوسیت کا بڑا خطرہ اور ایک طرف مامون کی ظاہری ولی عہدی قبول کرنے کا نسبتاً چھوٹا خطرہ۔

اصل اعتراض اس مفروضے میں سامنے آتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ولی عہدی کی دعوت خود مامون کی تجویز کردہ تھی۔ اس مفروضے کی بنا پر بہت سے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ امام علیہ السلام کو کسی بھی حال میں مامون کی دعوت کو ٹھکرا دینا چاہیے تھا اور اگر وہ جان لینے کی دھمکی دیتا تو آپؑ کو جان دے دینی چاہیے تھی۔ آپؑ کو مزاحمت کرنی چاہیے تھی اور ولی عہدی کے اس ظاہری اور نمائشی عہدے کو قبول کرنے کی بجائے اسی وقت موت کو قبول کر لینا چاہیے تھا۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں یہ فیصلہ کیا جانا ہے کہ کیا امام کو موت قبول کر لینی چاہیے تھی یا مامون کی پیشکش کو قبول کرنا درست اقدام تھا۔ اس کی وضاحت کیلئے ہم ایک شرعی مسئلہ بیان کرتے ہیں:

ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی رو سے انسان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے خود کو موت کے حوالے کرے، لیکن اگر ایسے حالات پیش آ جائیں کہ اس کی موت اس کے زندہ رہنے سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو جائے تو وہ خود کو موت کے حوالے کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ صورت پیش آ جائے کہ یا تو انسان موت قبول کر لے یا ایک بہت بڑے نقصان کا متحمل ہو جائے۔ جیسا حضرت امام حسین علیہ السلام کا واقعہ کہ یزید نے امام حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کی تھی تو آپؑ نے بیعت کرنے سے جان دینے کو ترجیح دے دی۔ یہ واقعہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب معاشرہ انسانی کو اس قسم کی قربانی کی اشد ضرورت تھی۔ دوسرے لفظوں میں دنیائے اسلام کو بیدار کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے وہی کچھ کرنا ضروری تھا جو کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کیا، لیکن امام رضا علیہ السلام کا زمانہ کچھ اور تھا۔ ہمارے سبھی آئمہ طاہرین علیہم السلام نے جام شہادت نوش کیا۔ اگر اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالتے تو بات اور تھی لیکن اکثر آئمہ علیہم السلام کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ شیعہ روایات کی رو سے اکثر آئمہ کی شہادت زہر کے ذریعہ واقع ہوئی ہے۔

یہ تو بے اختیاری کی صورت میں تھا۔ اب اگر ایک شخص کو اختیار دیا جائے کہ جان قربان کر دو یا وہ کام کرو جو کہ قاتل لینا چاہتا ہے؟ مثال کے طور پر اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ غروب سے پہلے قتل ہو جاؤ، یا فلاں کام انجام دے دو، تو ظاہر ہے میں زندگی کو ترجیح دوں گا۔ امام رضا علیہ السلام کو بھی دو کاموں کا اختیار دیا گیا تھا، قتل ہو جانے یا ولی عہدی کا منصب قبول کرنے کا؟ آپؑ نے اگر قتل کو ترجیح دی ہوتی تو تاریخ آپ کو کسی صورت میں معاف نہ کرتی۔ آپؑ نے دو صورتوں میں سے جو بہتر تھی اس کو اختیار کیا۔ آپؑ نے وقتی طور پر ولی عہدی کی حامی تو بھر لی لیکن مامون اور اس کی کسی طرح بھی حمایت نہ کی اور نہ ہی سرکاری امور میں تعاون کیا۔

آئمہ اطہارؑ کی نظر میں خلفاء کے ساتھ تعاون کرنا

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آئمہ اطہار علیہم السلام باوجودیکہ عباسی خلفاء کے سخت مخالف تھے اور اکثر اوقات لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے سے منع کرتے تھے لیکن جب اسلامی اہداف اور دینی مقاصد کے فائدے کی بات ہوتی تو آپؑ اپنے ماننے والوں کو حکومت وقت کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔

آئمہ طاہرین علیہم السلام کی وقت کے ظالم حکمرانوں کی سخت مخالفت کی ایک واضح مثال حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ایک معروف صحابی بار برداری کے اونٹوں کا کاروبار کرنے والے جناب صفوان کا مشہور واقعہ ہے۔صفوان نے سفر حج کیلئے اپنے اونٹ ہارون الرشید کو کرائے پر دیئے۔ کچھ دن بعد وہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرتؑ نے اس سے فرمایا: ایک کام کے سوا تمہارے سب کام ٹھیک ہیں۔ صفوان نے عرض کی: مولا! وہ کونسا کام؟ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اپنے اونٹوں کو ہارون کو کرایہ پر دینا۔ صفوان نے عرض کی: میں نے حج کیلئے اس کو اونٹ دیئے ہیں۔آپؑ نے فرمایا: تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر اس سے پوچھا: کیا تو نے اس سے کرایہ وصول کرنا ہے۔اس نے عرض کی: جی ہاں! فرمایا: کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ خیریت سے واپس لوٹے اور تو اس سے اپنا کرایہ وصول کرے؟ کہا: جی ہاں، مولا! آپؑ نے فرمایا: کسی ظالم کی خیریت اور زندہ رہنے کی اتنی خواہش کرنا بھی گناہ ہے۔صفوان امام علیہ السلام کا پکا عقیدتمند تھا۔اس کی ہارون کے ساتھ پرانی دوستی تھی۔مگر اس نے دنیاوی مقاصد کو ٹھکرا کر امامؑ کا حکم مانا اور آخرت کو ترجیح دی۔اس نے فوراً اپنے تمام اونٹ بیچ دیئے۔ ہارون کو اس کی اطلاع ہوئی تو صفوان کو دربار میں بلوا کر پوچھا: یہ تو نے کیا کیا؟ صفوان نے کہا: میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میرے بچے یہ کام نہیں کر سکتے، اس لئے میں نے اپنے اونٹوں کو بیچ دیا ہے۔ ہارون بڑا چالاک شخص تھا۔ کہنے لگا اس کی اصل وجہ بتاؤ کہ تو نے یہ کام کیوں انجام دیا؟ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سب کچھ تو نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وجہ سے کیا ہے۔صفوان بولا: نہیں ایسی بات کوئی نہیں۔ ہارون نے کہا: مجھے بے وقوف مت بنا۔ اگر تمہارے اور میرے درمیان دوستی کا پرانا رشتہ نہ ہوتا تو ابھی اور اسی وقت تیرا سر قلم کر دیتا۔

ہمارے آئمہؑ اس حد تک خلفاء کے ساتھ تعاون کرنے سے بھی منع کرتے تھے، لیکن جب کبھی اسلامی تعلیمات اور دینی مقاصد کی بات ہوتی تو آپؑ اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے کہ جاؤ اور ظلم کے ساتھ رہ کر مظلوموں کی مدد کرو۔ صفوان کا معاملہ چونکہ خالصتاً ہارون کے ساتھ مدد کرنا تھا، لیکن اگر ایک شخص سرکاری عہدے پر رہ کر غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرتا ہے تو یہ کام شرعی لحاظ سے جائز ہے، بلکہ ایسے اشخاص اور افراد کی موجودگی ہر معاشرہ کیلئے نعمت تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے آئمہ علیہم السلام کی سیرت اور قرآن مجید ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے۔

حضرت امام رضاؑ کا ایک استدلال

روایات میں ملتا ہے کہ اس حوالے سے بعض لوگوں نے حضرت امام رضا علیہ السلام پر اعتراض کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ کیا پیغمبروں کی شان بلند ہے یا ان کے اوصیاء کی؟ کہا گیا: پیغمبروں کی۔ فرمایا: کیا مشرک بادشاہ زیادہ برا ہے یا فاسق مسلمان بادشاہ؟ کہا: مشرک بادشاہ۔ فرمایا: کیا وہ شخص زیادہ قصوروار ہے جو خود کسی کو تعاون کی پیشکش کرے یا وہ جسے زبردستی اس پر مجبور کیا جائے؟ کہا: وہ جو خود تقاضا کرتا ہے۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا کہ: حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر تھے، عزیز مصر کافر و مشرک تھا، آپؑ نے خود ہی اس سے تقاضا کیا تھا کہ: ﴿اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾﴾[1] (مجھے ملکی خزانے پر مقرر کیجئے، میں اس کا امانتدار خزانچی اور اس کے حساب کتاب سے واقف ہوں)۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس عہدے سے حسن استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ عزیز مصر کافر تھا اور مامون فاسق مسلمان تھا۔ یوسفؑ پیغمبر تھے اور میں وصی پیغمبر ہوں۔ انہوں نے تقاضا کیا اور مجھے مجبور کیا گیا۔

ادھر حضرت امام کاظم علیہ السلام ایک طرف صفوان کو ہارون کو اونٹ کرائے پر دینے سے منع کر رہے ہیں تو دوسری طرف علی بن یقطین کہ جو مومن تھا اور تقیہ کئے ہوئے تھا، حضرتؑ اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس سے فرماتے ہیں کہ اس عہدے پر کام کرتے رہو، لیکن خفیہ طور پر، کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ تم شیعہ ہو، وضو کرو تو ان جیسا، نماز بھی انہی کے طریقہ پر انجام دو اور اپنے شیعہ ہونے کو حد سے زیادہ

---

[1] سورۂ یوسف، آیت ۵۵۔

مخفی رکھو۔ تمہارا اس اہم عہدے پر موجود رہنا ہی ضروری ہے، کیونکہ تمہاری وجہ سے ہمارے حقدار مومنوں کی مشکلات دور ہورہی ہیں۔

عام طور پر ہماری حکومتوں میں بھی ایسا ہوتا رہتا ہے کہ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے لوگ دوسری حکومتوں میں داخل کرتی ہیں۔ مذہبی جماعتیں بھی اپنے مذہبی نظریات کی تبلیغ اور تحفظ کیلئے ہر جگہ اپنے مبلغ بھیجتی ہیں۔ حق اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے تمام آئمہ اطہار علیہم السلام کی حکمت عملی ایک جیسی تھی۔ وہ ہر کام دینداری، خداخوفی اور پرہیزگاری کے جذبہ کے تحت انجام دیتے تھے۔ یہ تمام حضرات بنوامیہ اور بنوعباس کی حکومتوں کی مدد کرنے سے منع کرتے تو سخت منع کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی ظالم حکومت کو فائدہ دینا ہی دراصل ظلم کی مدد کرنا ہے، لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کے فائدہ کی بات ہوتی تو آپؑ اپنے ماننے والوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے جیسا کہ علی بن یقطین اور اسماعیل بن بزیع کی مخلصانہ خدمات کو سراہا گیا۔ ہماری شیعہ روایات میں حیرت انگیز طور پر ان کی تعریف وتوصیف کی گئی۔ ان کو اولیاء اللہ (دوستان خدا) کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ جناب شیخ انصاریؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مکاسب'' میں ولایت جائر کے بارے میں ان روایات کو نقل کیا ہے۔

ظالم کی حکومت

ہماری فقہ کی کتب میں ''ولایت جائر'' یعنی ظالم حکومت کے بارے میں بہت بات کی گئی ہے۔ فقہ میں ہے کہ ظالم حکومت میں کسی سرکاری عہدہ کو قبول کرنا ذاتی طور پر حرام ہے، لیکن ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ ذاتی طور حرام ہے، لیکن بعض حالات میں مستحب اور بعض میں واجب ہے۔ مجتہدین نے لکھا ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تبلیغی فرائض کی ادائیگی، حکومتی عہدہ قبول کرنے پر موقوف ہو تو عہدہ قبول کرنا واجب ہے۔ عقلی تقاضا بھی یہی ہے کہ اقتدار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ارفع واعلیٰ اہداف کو حاصل کیا جائے۔ اس سے آدمی اپنے دشمنوں کو بھی کمزور کرسکتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں اور مالی لحاظ سے مضبوط لوگ اپنے آدمی مختلف عہدوں اور سرکاری شعبوں میں رکھتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کا منصب قبول کرکے

حکومت کا ایک کام بھی نہ کیا، بلکہ آپؑ نے اس سے اپنے علمی و دینی مقاصد پورے کئے۔ اگر آپؑ کو یہ عہدہ نہ ملتا تو آپؑ کی علمی اور مذہبی رفعت دب کر رہ جاتی۔ جس طرح اس وقت کی حکومت حضرت علی علیہ السلام سے دینی مسائل حل کراتی تھی، اس طرح مامون کی حکومت امام رضا علیہ السلام سے مشورہ کر کے لوگوں کے شرعی مسائل حل کرتی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو کام کرنے کا موقع ملا۔ آپؑ نے علم و عمل کی ترقی و پیشرفت میں وہ نمایاں کارنامے انجام دیئے کہ جو رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ حضرت صادق آل محمد علیہم السلام نے بنوعباس اور بنوامیہ کی باہمی چپقلش کے دور سے خوب فائدہ اٹھایا۔ آپؑ نے بہت کم عرصہ میں چار ہزار شاگرد پیدا کر کے ملت اسلامیہ پر بہت بڑا احسان کر دیا۔ اسی طرح مامون چونکہ ایک دانشور حکمران تھا اس نے مختلف مذاہب کے علماء کو اپنے دربار میں بلوا کر امام رضا علیہ السلام سے مباحثے کرائے۔ اس عرصے میں آپؑ نے علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ اگر آپؑ اس عہدہ پر فائز نہ ہوتے تو امت آپؑ سے اس حد تک مستفید نہ ہو سکتی۔ امام علیہ السلام نے ولی عہدی کے منصب سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہ کیا۔ البتہ علمی و دینی خدمت کے حوالے سے آپؑ نے اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور یوں طالبان علم کی جستجوئے علم پوری ہوتی رہی۔

سوال و جواب

سوال: جب امیر شام نے یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کیا تو اس کی سب نے مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ یزید کا فسق و فجور نہ تھا بلکہ لوگ بنیادی طور پر اس کی ولی عہدی کے مخالف تھے۔ تو پھر کیا مامون کے دور خلافت میں کسی کا ولی عہد بننا کیسے جائز ہو گیا؟

جواب: سب سے پہلے تو یہ کہنا ہرگز غلط ہے کہ یزید کی صرف ولی عہدی کی مخالفت ہوئی ہے، بلکہ مخالفت تو اس بات کی ہوئی کہ دنیائے اسلام میں پہلی بار بدعت وجود میں آئی۔ امام حسین علیہ السلام نے بدعت کے خلاف آواز بلند کی۔ اس وقت یزید اسلامی تعلیمات کو تقریباً کالعدم قرار دے چکا تھا۔ یزید کا رویہ اور انداز فکر کافروں، مشرکوں اور منافقوں سے بھی بدتر تھا۔ اس بدکردار شخص کی بدکاریوں سے انسانیت بھی شرماتی تھی۔ امام رضا علیہ السلام نے خود ولی عہدی کے تصور کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یہ ولی عہدی کیا چیز ہے، بلکہ یہ خلافت تو ہمارا حق ہے۔ آپؑ نے مامون سے بھی کہا تھا: مامون! ذرا یہ تو بتا کہ خلافت تیرا حق ہے یا کسی اور کا ہے؟ اگر یہ غیر کا مال ہے تو تو دینے کا حق نہیں رکھتا۔

سوال: آپ فرض کریں کہ اگر فضل بن سہل واقعی طور پر شیعہ تھا کہ اس نے حضرتؑ کو ولی عہد بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور اس کے بعد اس نے مامون کی حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کیا۔ اب یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ حضرتؑ نے ایک مدت تک مامون کے حکومتی امور کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کیا، حالانکہ حضرت علی علیہ السلام کی سیرت گواہ ہے کہ آپؑ ظالم کے کسی کام پر راضی ہونے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔

جواب: لگتا ہے یہ جو سوال اٹھایا گیا ہے سوچ سمجھ کر نہیں اٹھایا گیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ فضل بن سہل شیعہ تھا اور حضرتؑ مامون کی حکومتی سطح پر مدد کرتے رہے اور یہ کام جائز نہیں ہے، کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام نے امیر شام کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بات یہ ہے حضرت امام رضا علیہ السلام و مامون اور حضرت علی علیہ السلام و امیر شام کے مابین بہت فرق ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام کا مسئلہ یہ تھا کہ امیر شام اگر اپنے عہدے پر بحال رہتا تو امام علی علیہ السلام کا ماتحت ہوتا۔ بھلا علی علیہ السلام جیسی عظیم ہستی ایسے شخص کو کس طرح اپنا ماتحت بنا سکتی تھی؟ مگر امام رضا علیہ السلام نے تو ایک روز بھی مامون کے ساتھ کسی قسم کی مدد نہ کی۔ یہاں پر ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نلکے کی ٹونٹی کھول دیتا ہوں اور پانی آپ کے صحن میں جمع ہو جاتا ہے اور آپ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اس نقصان کا ضامن میں ہوں نہ کہ نلکا، نہ میں ٹوٹی کھولتا اور نہ آپ کا نقصان ہوتا؟ پھر کسی اور وقت میں گلی سے گزرتا ہوں دیکھتا ہوں کہ وہاں پر نلکا کھلا ہوا ہے اور آپ کی دیوار تک پہنچا ہوا ہے۔ یہاں پر میری اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ نلکے کو بند کر کے آپ کی خدمت کروں اور آپ کو نقصان سے بچالوں۔ یہاں پر پانی کا بند کرنا مجھ پر واجب نہیں ہے۔ میں نے عرض کی ہے کہ ان دو باتوں میں آپس میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہے کہ جو چاہو کرتے رہو اور ایک شخص دوسرے شخص کے کسی کام میں حصہ نہیں لیتا ہے، بلکہ اس کو برے کاموں سے بھی روکتا ہے۔ اس صورت میں دوسرا شخص اگر گناہ کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری گناہ کے مرتکب ہونے

والے پر ہوگی۔ امیر شام کی خواہش تھی کہ حضرت علی علیہ السلام اس کی حکومت کو تسلیم کریں، لیکن مامون کی خواہش یہ تھی کہ امام رضا علیہ السلام اس کی حکومت کے مقابلے میں خاموش رہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ امام علیہ السلام مامون کی حکومت میں چپ کیوں رہے، خاموشی اختیار کیوں کی؟ تو عرض ہے کہ آپؑ کسی بڑی مصلحت کے تحت خاموش تھے اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے حوالے سے ماحول سازگار ہو رہا تھا۔ کسی عظیم مصلحت کی خاطر انتظار کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے، امیر شام کا مسئلہ ایک تو اور نوعیت کا تھا اور دوسرے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نہیں چاہتا کہ ظالم کی حکومت ایک دن بھی رہے۔ اگر امام علی علیہ السلام امیر شام کی حکومت پر خاموش رہتے تو وہ روز بروز طاقتور ہوتا لیکن یہاں پر صبر کیا جا رہا ہے تو مامون روز بروز کمزور ہوا اور امام رضا علیہ السلام مضبوط ہوئے۔ چنانچہ ان دو مسئلوں کا ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو زہر نہیں دیا گیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا لوگوں کو معلوم ہو رہا تھا، خلافت کے حقدار حضرت امام رضا علیہ السلام ہیں، اس لئے مامون نے مجبور ہو کر حضرتؑ کو زہر دے دیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ۵۲ سال کی عمر میں دنیا سے کوچ فرمایا۔ آپؑ کی زندگی بالکل پاک و پاکیزہ تھی۔ آپؑ کی صحت کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ حدیث میں بھی ہے کہ "مَامِنَّا اِلَّا مَقْتُوْلٌ اَوْ مَسْمُوْمٌ" کہ ہم آئمہؑ میں سے ہر فرد یا تو قتل ہوا ہے یا زہر سے شہید کیا گیا ہے۔ یہ بات شیعہ مؤرخین کے نزدیک مسلم حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ اب اگر مروج الذہب کے مصنف مسعودی نے غلطی کی ہے تو اس میں حقائق کو تو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا اس مسئلہ کے بارے میں کچھ وضاحت فرمایئے؟

جواب: میں نے کبھی نہیں کہا اور نہ ہی میرا عقیدہ ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو زہر سے شہید نہیں کیا گیا، بلکہ آپ نے میرے سوال کو میرا نظریہ سمجھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام علیہ السلام کو اس لئے زہر سے شہید کیا گیا کہ آپؑ کی مقبولیت عوام میں بڑھتی جا رہی تھی اور مامون کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو اس نے یہ بہیمانہ حرکت کر دی۔ امام علیہ السلام کی شہادت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ بغداد میں انقلابی تحریک کا خطرہ تھا۔ مامون کی نظریں مسلسل بغداد کے حالات پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے امام علیہ السلام کو اس وقت زہر دے کر

شہید کیا جب وہ بغداد کی شورش پر قابو پانے کیلئے خراسان سے بغداد جا رہا تھا۔ اسے اطلاع دی جا رہی تھی کہ بغداد کے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ اس صورت حال میں وہ نہ تو امام رضاؑ کو معزول کر سکتا تھا اور نہ ہی انہیں اس عہدے پر بحال رہتے ہوئے خراسان چھوڑ کر بغداد روانہ ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں اس نے بغداد کے عباسیوں کو راضی کرنے اور ان کی مخالفت کو حمایت میں بدلنے کیلئے حضرتؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا تا کہ بغاوت پر اترے ہوئے عباسیوں کو کہہ سکے کہ میں نے کام تمام کر دیا ہے۔ زہر دینے کی اصل وجہ یہی ہے اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس لئے کہ ایسی صورت حال میں مامون نہ بغداد جا سکتا تھا اور نہ آپؑ کو ولی عہدی سے معزول کر سکتا تھا۔ مامون نے بدلتے ہوئے ماحول کو دیکھ کر ارادہ کیا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام اور فضل بن سہل دونوں سے جان چھڑا لی جائے۔ اس نے فضل کو ''سرخس'' کے ایک حمام میں چند مسلح افراد کے ذریعے قتل کرا دیا اور مشہور کرا دیا کہ فضل ذاتی دشمنی کا نشانہ بن گیا ہے، حالانکہ فضل کے قتل کی سازش مامون ہی کی تیار کردہ تھی۔ فضل کے قتل کے بعد یہ پوری طرح سے ملک اور سیاست پر حاوی ہو گیا۔ جاسوسوں کے ذریعے اس کو بغداد کی سیاسی صورت حال معلوم ہوتی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام اور علوی سادات کی موجودگی میں وہ بغداد میں نہیں جا سکتا تو اس نے امام رضا علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا اور زہر دے کر آپؑ کو شہید کر دیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں اور ہمارے اس موقف کی تائید میں تاریخ کی سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں کہ امام علیہ السلام طبعی موت نہیں مرے، بلکہ زہر کے ذریعے آپؑ کی شہادت واقع ہوئی۔

✲✲✲✲✲

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام[1]

آیت اللہ شیخ محمد جواد لنکرانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے ایام ہیں۔ یہاں دو موضوع توجہ طلب ہیں: ایک آپؑ کی زندگی اور آپؑ کی امامت کا موضوع ہے کہ جس کی مدت چھ سال تھی اور یہ کم عرصہ تھا اور دوسرا آپؑ کے بعد حضرت امام زمانہؑ کی امامت کا آغاز ہے جو تاریخ شیعہ کے نازک ترین نکات میں سے ایک ہے۔

یہ دور یعنی امام عسکری علیہ السلام کی امامت کا اور وہ مقدمات جو امام عسکری علیہ السلام نے امام زمانہ علیہ السلام کی امامت کیلئے فراہم کئے، تاریخ شیعہ کا نازک دور کہلاتا ہے۔ علماء وطلاب اور شیعیان عزیز کو تاریخ کے اس حصے پر گہرائی سے توجہ کرنی چاہیے، تاکہ وہ مضبوط اعتقادات جو حضرت حجت علیہ السلام کے متعلق ہیں، وہ مضبوط انداز سے باقی رہیں۔

میں دو حصوں میں کچھ نکات عرض کروں گا۔ پہلے حصے میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے متعلق کچھ نکات عرض کروں گا، کیونکہ سال بھر میں بھی اس امام عالی مقام علیہ السلام کے بارے میں کم گفتگو ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں امام عسکری علیہ السلام نے امام زمانہؑ کے بارے میں جو راہ ہموار کی ہے اور لوگوں کو اس بارے میں آگاہی دی ہے اس کے بارے میں عرض کروں گا۔

---

[1] استاد حوزہ علمیہ قم جناب آیت اللہ شیخ محمد جواد لنکرانی کا حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیرت طیبہ پر جامع خطاب۔ بشکریہ از: (www.fazellankarani.com)۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے نہ صرف مخالفین آپؑ کی امامت کے معترف تھے، بلکہ اس وقت کا حاکم (معتمد عباسی) بھی امام عسکری علیہ السلام کی امامت کا اعتراف کرتا تھا۔ بنیادی طور پر تاریخ کے مسلمہ امور میں سے ایک یہ ہے کہ بنوامیہ کے حکام اور بنوعباس کے حکام دونوں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتے تھے کہ امامت، آئمہ طاہرین علیہم السلام کا مسلمہ حق ہے۔ ان کیلئے روزِ روشن کی طرح واضح تھا کہ امامت اہلبیت علیہم السلام کا حق اور ان کی شان میں ہے۔ اس کے علاوہ امامت سے متعلق روایات ودلائل کی بنا پر یہی حکمران ان کے بارے میں عام لوگوں سے زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ خود آئمہ طاہرین علیہم السلام کی زندگی وآثار اور اوصاف بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ امامت اہلبیت علیہم السلام کا حق ہے۔

ایک دفعہ حضرت امام عسکری علیہ السلام کے بھائی جعفر نے معتمد عباسی سے جب یہ کہا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ میں شیعوں کیلئے بطور امام منصوب ہوجاؤں تو معتمد عباسی نے اس کے جواب میں یوں کہا:

اِعْلَمْ اَنَّ مَنْزِلَةَ اَخِیکَ لَمْ تَکُنْ بِنَا اِنَّمَا کَانَتْ بِاللهِ عَزَّ وَ جَلَّ۔

یہ مقام ومرتبہ جو تیرے بھائی کا ہے وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہم نے ان کو یہ مرتبہ نہیں دیا ہے یہ مرتبہ تو خداوند عزوجل نے ان کو دیا ہے۔[1]

یہ واقعہ آج کل کے ان لوگوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے جو آج کل آئمہ طاہرینؑ کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پھیلانے کی کوشش میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ امامت کو اس کے مقام ومرتبہ سے نیچے لائیں، جبکہ انہی ابتدائی صدیوں میں معتمد عباسی جیسے آئمہ طاہرینؑ کے دشمن نے اعتراف کیا کہ یہ مقام ومرتبہ ہمارے ہاتھ میں نہیں، ہم نے ان کو نہیں دیا ہے یہ مقام تو خداوند تبارک وتعالیٰ کے اذن سے ہے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے:

نَحْنُ کُنَّا نَجْتَهِدُ فِی حَطِّ مَنْزِلَتِهِ وَ الْوَضْعِ مِنْهُ وَ کَانَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ یَاْبٰی اِلَّا اَنْ یَزِیدَهُ کُلَّ یَوْمٍ رِفْعَةً بِمَا کَانَ فِیهِ مِنَ الصِّیَانَةِ وَ حُسْنِ السَّمْتِ وَ الْعِلْمِ وَ الْعِبَادَةِ۔

ہم تو یہی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ہم ان کو لوگوں کی نظروں سے گرادیں، لوگوں کے

---

[1] کمال الدین، ج ۲، ص ۴۷۹۔

درمیان ان کے مقام ومرتبہ کو کمزور کردیں، لیکن جو بھی ہو خداوند عالم کا ارادہ یہ ہے کہ علم، عبادت اوران کی دیگر صفات حسنہ کی بنا پران کے مقام ومرتبے کو بلند کرے۔[1]

یعنی معتمد عباسی اس بات کا اقرار کررہا ہے کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ امام عسکری علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کولوگوں کے سامنے کم کرے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں دوسرا نکتہ وہ دلچسپ واقعات ہیں جوآپؑ کے زمانے میں واقع ہوئے ہیں، جن میں دوسرے مذاہب کے لوگوں نے شیعوں کی حقانیت اورامام عسکری علیہ السلام کی امامت کا اعتراف کیا ہے۔ اگر ہم تاریخ کی جانچ پڑتال کریں تو یہ اہم بات سامنے آئے گی کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی امامت کہ جن میں امام عسکری علیہ السلام بھی شامل ہیں کا اقرار صرف شیعہ نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب بھی اس کے معترف ہوتے تھے۔ ان میں عیسائی پادری، راہب اوردوسرے مذاہب یعنی یہود ونصاریٰ کے علماء سب شامل تھے جوامام عسکری علیہ السلام کی اوراہل بیت علیہم السلام کی امامت کے معترف تھے۔

انوش نصرانی کا واقعہ بہت مشہور ہے۔اس نے معتمد عباسی سے کہا کہ وہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے اس کے دو بیٹوں کی تندرستی اورصحت یابی کیلئے دُعا کرنے کو کہے۔انوش نے کہا کہ: نَحْنُ نَتَبَرَّکُ بِدُعَاءِ بَقَایَا النُّبُوَّةِ وَ الرِّسَالَةِ: ''ہم نبوت ورسالت کے خاندان سے دُعا کو بابرکت سمجھتے ہیں (اوران کی برکت سے ہماری مشکلیں حل ہوتی ہیں)''۔

یہ قصہ مفصل ہے: جب امام عسکری علیہ السلام سے کہا گیا کہ انوش نصرانی نے ایسا جملہ کہا ہے تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ النَّصْرَانِیَّ اَعْرَفَ بِحَقِّنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔
خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمارے حق کے متعلق اس عیسائی کو مسلمانوں سے زیادہ آگاہ قرار دیا۔

---

[1] کمال الدین، ج ۲، ص ۴۷۹۔

البتہ اس سے مراد خود امام علیہ السلام کے زمانے کے مسلمان ہیں۔ وہ بھی سارے نہیں، بلکہ ان میں سے ایک گروہ یعنی وہ لوگ جو اسلام کا دعویٰ کرتے تھے مگر انہوں نے خلافت کو غصب کر کے خود کو مسلمانوں کا حاکم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد امام علیہ السلام انوش نصرانی کے گھر تشریف لے گئے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ انوش نے امامؑ کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ وہ برہنہ سر اور ننگے پاؤں امام کے استقبال کو گیا۔ اس کے گرد عیسائی علماء کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس نے اپنے سینے سے انجیل لگا رکھی تھی اور کہہ رہا تھا ہم آپؑ سے اسی کتاب کے ذریعہ متوسل ہوئے کہ جس کے آپؑ ہم سے زیادہ عالم ہیں۔ اس کے بعد امام علیہ السلام سے عرض کیا:

یَا سَیِّدَنَا! اَتَوَسَّلُ اِلَیکَ بِھٰذَا الْکِتَابِ الَّذِی اَنْتَ اَعْرَفُ بِهٖ مِنَّا اِلَّا غَفَرْتَ لِیْ ذَنْبِی فِیْ عِنَاکَ وَ حَقِّ الْمَسِیحِ عِیسَی بْنِ مَرْیَمَ وَ مَا جَآءَ بِهٖ مِنَ الْاِنْجِیلِ مِنْ عِنْدِ اللهِ مَا سَئَلْتُ اَمِیرَ الْمُؤْمِنِیْنَ مَسْئَلَتَکَ ھٰذِهٖ اِلَّا لِاَنَّا وَجَدْنَا کُمْ فِیْ ھٰذَا الْاِنْجِیلِ مِثْلَ الْمَسِیحِ عِیسَی بْنِ مَرْیَمَ عِنْدَ اللهِ۔

اے ہمارے سیّد و سردار! میں آپؑ کو اس کتاب کہ جس کا آپؑ ہم سے بہتر علم رکھتے ہیں، کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپؑ مجھے اس قدم رنجہ فرمائی کی تکلیف معاف فرما دیں۔ مجھے قسم ہے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور جو کچھ انجیل میں اللہ کی طرف سے آیا ہے اس کی! میں نے خلیفہ سے یہ درخواست صرف اس لئے کی تھی کیونکہ ہماری انجیل کے مطابق آپ حضراتؑ کو بھی اللہ کے ہاں وہی مقام و مرتبہ حاصل ہے جس کے مالک حضرت مسیح علیہ السلام تھے۔[1]

ظاہر ہے اس سے وہ انجیل مراد ہے جو حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے میں تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کے اوصیاء کی خصوصیات بھی اس کتاب میں موجود تھیں۔ یہ ایسے نکات ہیں کہ جن کے اوپر ہمیں بہت غور کرنا چاہیے۔ آج کی انجیل شاید اس سے مختلف ہو۔ یعنی امام عسکری علیہ السلام کے زمانے کے بعد (تقریباً بارہ سو سال گزرنے کے بعد) موجودہ انجیل میں شاید پیغمبر کے ان اوصیاء کے بارے میں کوئی چیز نہ ملے، (اگرچہ بعض اناجیل میں کچھ اشارے ملتے ہیں) مگر اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ انجیل

[1] حلیۃ الابرار، ج ۶، ص ۱۱۱۔

جو اس وقت تھی اور اس پادری نے خود اعتراف کیا کہ ہم اس کتاب میں خدا کے نزدیک آپؑ کے مرتبہ کو جناب مسیح کا ہم مرتبہ ہی دیکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہمارا (شیعوں کا) عقیدہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام حضرت مسیح علیہ السلام سے بہت افضل ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ اس کی دلیل بھی موجود ہے، لیکن ان نصرانیوں کی معرفت کی مقدار اسی قدر تھی۔ البتہ یہی افراد بھی ہمارے لئے بہت اہم ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی کتاب میں آپؑ کے مقام و مرتبہ کو دیکھا اور خدا کے نزدیک آپؑ کا مرتبہ عیسیٰ سے کم نہیں، اس لئے آپؑ سے درخواست کی ہے کہ یہاں تشریف لائیں۔

امام علیہ السلام نے اس کے بیٹوں کو دیکھا اور فرمایا: یہ بیٹا زندہ رہے گا اور شیعہ ہو جائے گا اور اہلبیت عصمت وطہارت کے دوستوں میں سے ہوگا، لیکن دوسرا تین دن کے بعد دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ تاریخ میں ہے کہ وہی کچھ ہوا جو امام علیہ السلام نے بیان فرمایا تھا۔

پس یہ حاکم عباسی اور مختلف مذاہب کا حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں اعتراف ہے امامؑ ایک معصوم امام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے ہیں جن کا یہ مقام و مرتبہ ہے کہ جوانی کے عالم میں ہی حاکم عباسی اور دوسرے سارے آپؑ کا احترام ایک عام آدمی کے لحاظ سے نہیں بلکہ خدا کی منتخب فرد و شخصیت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زہد و عبادت کے اعتبار سے یہی مشہور واقعہ کافی ہے کہ زمانے کے سب سے برے دو آدمیوں کو امامؑ کا زندان بان مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد دیکھا گیا کہ وہ دونوں عبادت گزار ہو گئے ہیں۔ ان کو بلایا گیا اور ڈانٹ کے کہا گیا کہ ہم نے تم دونوں کو نگرانی کیلئے بھیجا تھا، لیکن تم دونوں ہی بدل گئے ہو؟ تو ان دونوں نے کہا:

مَاتَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ یَصُوْمُ النَّهَارَ وَیَقُوْمُ اللَّیْلَ کُلَّهُ لَا یَتَکَلَّمُ وَلَا یَتَشَاغَلُ وَاِذَا نَظَرْنَا اِلَیْهِ ارْتَعَدَتْ فَرَائِصُنَا وَیُدَاخِلُنَا مَالَا نَمْلِکُهُ مِنْ اَنْفُسِنَا۔

تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو پوری رات کو عبادت کرتا ہے، دن کو

روزے رکھتا ہے، جو کوئی بات کرتا ہے نہ کوئی اور کام کرتا ہے۔ ہم جب بھی اسے
دیکھتے ہیں ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ہم بے قابو ہوجاتے ہیں۔[1]

یہاں پر ہم علوم دینی کے طلاب کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کو زمانے کی چیرہ دستیوں سے ہٹ کر جب بھی تنہائی کا کوئی موقع ملتا تھا تو آپؑ حضرات زیادہ تر عبادت اور خدا کی بندگی میں مشغول رہتے تھے۔ آپؑ ہمیشہ عبادت و بندگی کیلئے فراغت کی تلاش میں رہتے تھے۔

ہمیں بھی اپنی بساط کے مطابق ایسا ہونا چاہیے۔ ہمارے عمل سے اسلام، تقویٰ اور خدا کی بندگی ظاہر ہونی چاہیے۔ یہ ریا کی خاطر نہ ہو کہ خدانخواستہ دوسروں کو دکھانے کیلئے ہم ان نیک کاموں کے پیچھے رہیں۔ خاص طور پر اس دور میں ہمیں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ لوگ ہمیں عمل میں دیکھیں کہ ہم زاہد ہیں۔ محض دعوے اور نعرے اور دکھاوے کی حد تک ہی نہیں بلکہ عملی طور پر ہمیں دیکھیں کہ ہم عبادت گزار ہیں۔ عملی طور پر دیکھیں کہ ہم دنیا پرست نہیں، بلکہ دنیا سے منہ موڑنے والے ہیں۔ یہ ہمارے تمام آئمہ علیہم السلام کی سیرت کا لازمی جزو تھا۔ خاص طور پر امام عسکری علیہ السلام کی سیرت میں اس کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں گفتگو اس سے کہیں زیادہ مفصل ہے۔ امام عسکری علیہ السلام نے تین عباسی حکمرانوں کا دور دیکھا۔ اس وقت کیا کیا مسائل رونما ہوئے۔ ان تینوں حکمرانوں کے ساتھ امامؑ کا رویہ کیسا تھا؟ یہ بھی بہت تفصیلی گفتگو ہے۔ اس بارے میں آپ تاریخ کا مطالعہ کریں۔

البتہ تاریخ شیعہ کا اس سے بھی اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ آج اہل سنت کا بھی عقیدہ ہے کہ امام زمانہؑ آئیں گے۔ وہی شخص جن کے بارے میں ''مصلح کل'' کے عنوان سے وعدہ دیا گیا ہے کہ آخر زمان میں آئیں گے۔ اہل سنت اس بات کو قبول بھی کرتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ آپؑ ابھی تک پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ہم ان سے اس مقام پر یہ کہتے ہیں کہ آپ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو تو مانتے ہو۔ آپ کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ سبط بن جوزی کتاب تذکرۃ الخواص میں جب امام عسکری علیہ السلام کے بارے

---

[1] الکافی، ج ۱، ص ۵۱۲۔

میں لکھتے ہیں تو کہتے ہیں: عَالِمًا ثِقَةً یعنی وہ ثقہ عالم کے عنوان سے امامؑ کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: رَوَی الْحَدِیْثَ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ: (انہوں نے اپنے والد گرامی اور جدّ سے روایت کی ہے)۔

پس آپ اہل سنت خود حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو ایک ثقہ کے لحاظ سے مانتے ہیں، حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے امام زمانہ علیہ السلام کے بارے میں چالیس احادیث موجود ہیں، آپؑ نے امام زمانہؑ کی ولادت کی جو بشارت دی وہ ولادت سے پہلے ہی ہے اور خصوصیات بھی بیان فرمائیں، نام بھی بتایا اور تفصیلات بھی بیان فرمائیں، آپ کے پاس ان چالیس روایات کا کیا جواب ہے؟ اگر آپ اعتراف کرتے ہیں کہ امام عسکری علیہ السلام عالم وثقہ ہیں، اگرچہ آپ ان کی امامت کا اقرار نہ بھی کریں تو امام زمانہؑ کی ولادت اور خصوصیات کے بارے میں امام عسکری علیہ السلام سے مروی روایات کی طرف آپ کو توجہ دینا ہوگی جن میں فرمایا گیا ہے کہ امام زمانہ علیہ السلام خدا کی حجتوں میں سے آخری حجت ہیں اور آپؑ کی طولانی غیبت ہوگی۔

حسن بن محمد بن صالح بزاز کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اِنَّ ابْنِیْ هُوَ الْقَآئِمُ مِنْ بَعْدِیْ وَ هُوَ الَّذِیْ یَجْرِیْ فِیْهِ سُنَنُ الْاَنْبِیَآءِ بِالتَّعْمِیْرِ وَ الْغَیْبَةِ حَتّٰی تَقْسُوَ قُلُوْبٌ لِطُوْلِ الْاَمَدِ وَ لَا یَثْبُتَ عَلَی الْقَوْلِ بِهٖ اِلَّا مَنْ کَتَبَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ فِیْ قَلْبِهِ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهٗ بِرُوْحٍ مِنْهُ۔

تحقیق! میرا بیٹا ہی قائم ہے جو میرے بعد آئے گا۔ طولانی عمر اور طولانی غیبت کے لحاظ سے اس میں انبیاءؑ کی سنتیں جاری ہوں گی۔ ان کی غیبت طولانی ہوگی کہ جس کی وجہ سے لوگوں میں سخت دلی آئے گی۔ صرف وہ آدمی اس قول پر ثابت اور حقیقی منتظروں میں سے ہوگا جن کے دل میں اللہ نے ایمان کو راسخ کر دیا ہو اور اپنی جانب سے ایک روح کے ذریعہ ان کی تائید فرمائی ہو۔[1]

پس آخری حجت پر عقیدے کا ایک اضافی پہلو یہ بھی ہے کہ جو مومنین آپؑ کا انتظار کر رہے ہیں،

---

[1] کمال الدین، ج ۲، ص ۵۲۴۔

ان کیلئے خدا کی جانب سے خاص تائید بھی ہوتی ہے۔

ایک اور روایت محمد بن عبدالجبار نقل کرتے ہیں کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْاِمَامَ وَ الْحُجَّةَ بَعْدِیَ ابْنِیْ سَمِیُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ(ص) وَ کَنِیُّهُ الَّذِیْ هُوَ خَاتِمُ حُجَجِ اللّٰهِ وَ خُلَفَآئِهٖ۔

میرے بعد امام اور حجت میرا بیٹا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم نام، ہم کنیت اور اللہ کی آخری حجت اور اس کا آخری جانشین ہے۔[1]

یہ جملے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے حضرت امام زمانہ علیہ السلام کے بارے میں فرمائے ہیں۔

ایک اور نکتہ جس کی جانب ہم یہاں اشارہ کریں گے یہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام میں سے حضرت امام حسن عسکری، حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام علی نقی علیہم السلام نے زمانہ غیبت کے حوالے سے بھی مومنوں کی ذمہ داریوں کو واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

لَوْ لَا مَنْ یَّبْقٰی بَعْدَ غَیْبَةِ قَآئِمِنَا مِنَ الْعُلَمَآءِ الدَّاعِیْنَ اِلَیْهِ وَ الدَّالِّیْنَ عَلَیْهِ وَ الذَّابِّیْنَ عَنْ دِیْنِهٖ بِحُجَجِ اللّٰهِ وَ الْمُنْقِذِیْنَ لِضُعَفَآءِ عِبَادِ اللّٰهِ مِنْ شِبَاكِ اِبْلِیْسَ وَ مَرَدَتِهٖ وَ مِنْ فِخَاخِ النَّوَاصِبِ لَمَا بَقِیَ اَحَدٌ اِلَّا ارْتَدَّ عَنْ دِیْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّهُمُ الَّذِیْنَ یُمْسِكُوْنَ اَزِمَّةَ قُلُوْبِ ضُعَفَآءِ الشِّیْعَةِ كَمَا یُمْسِكُ صَاحِبُ السَّفِیْنَةِ سُكَّانَهَا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْاَفْضَلُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ۔

اگر ہماری آخری حجت کی غیبت کے زمانہ میں امام زمانہؑ کی جانب دعوت دینے والے اور آپؑ کی طرف راہنمائی کرنے والے علماء وفقہا نہ ہوتے جو کمزور عقیدے کے مالک لوگوں کو شیطان اور اس کے چیلوں اور ناصبیوں کی دسیسہ کاریوں سے نجات دلانے والے ہیں تو سارے لوگ خدا کے دین سے پھر جاتے، مگر یہ علماء وفقہاء ہیں جو ضعیف شیعوں کے عقائد کو اس طرح بچاتے ہیں جس طرح ملاح کشتی پر سوار لوگوں کو بچاتا ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل، ج ۱۲، ص ۲۸۰۔

یہی لوگ اللہ کے نزدیک بہت فضل و مرتبے کے حامل ہیں۔[1]

زمانۂ غیبت میں علماء اور فقہاء کی جانب یہ توجہ جو ہوئی ہے یہ خود آئمہ معصومین علیہم السلام کی جانب سے ہوئی ہے، تاکہ ہمارے لوگوں پر اچھی طرح سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دینداری کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ دین کو علماء اور فقہاء سے لیا جائے، مراجع عظام سے دین لیا جائے۔ اگر کہیں کچھ لوگ پیدا ہو جائیں جو کہہ دیں کہ اسلام کو سمجھنے کیلئے ہمیں علماء و فقہاء کی ضرورت نہیں تو یہ بات آئمہ معصومین علیہم السلام کے واضح ارشادات کے خلاف ہے۔ یہ باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ خصوصاً ان دنوں میں کہ جب انقلاب اسلامی کی کامیابی کی سالگرہ بھی ہے، یہ سب جان لیں کہ اس انقلاب کا اصلی جوہر ''دین'' ہے۔ اس انقلاب کا اصلی جوہر ''علماء'' ہیں۔ اس انقلاب کا بنیادی تقاضا ''فقہاء سے ہی صحیح دین لینا'' ہے۔ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر جو ان تمام علماء میں سرفہرست ہیں اور دوسرے بزرگ علماء۔ جب ہم ان روایات کو مدنظر رکھتے ہیں تو عوام الناس کا فریضہ بالکل واضح ہوتا ہے۔

پس اہل سنت بھی حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے وجود کو مانتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ آپؑ کس تاریخ کو پیدا ہوئے اور کونسی تاریخ میں شہید ہوئے اور آپؑ کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے علم رجال کی کتابوں میں امام کو ثقہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے، امام زمانہ علیہ السلام کے بارے امام عسکری کی چالیس روایات بھی ہیں۔ پس وہ کیسے امام زمانہ علیہ السلام اور آپؑ کی ولادت کا انکار کر سکتے ہیں۔

ان روایات میں سے ایک یہ ہے کہ حسن بن ظریف کہتے ہیں:

اِخْتَلَجَ فِیْ صَدْرِیْ مَسْئَلَتَانِ اَرَدْتُّ الْکِتَابَ فِیْهِمَا اِلٰی اَبِیْ مُحَمَّدٍ(ع) فَکَتَبْتُ اَسْئَلُهٗ عَنِ الْقَآئِمِ(ع) اِذَا قَامَ بِمَا یَقْضِیْ وَ اَیْنَ مَجْلِسُهُ الَّذِیْ یَقْضِیْ فِیْهِ بَیْنَ النَّاسِ وَ اَرَدْتُّ اَنْ اَسْئَلَهٗ عَنْ شَیْءٍ لِّحُمَّی الرِّبْعِ فَاَغْفَلْتُ خَبَرَ الْحُمّٰی فَجَآءَ الْجَوَابُ: سَئَلْتَ عَنِ الْقَآئِمِ. فَاِذَا قَامَ قَضٰی بَیْنَ النَّاسِ بِعِلْمِهٖ کَقَضَآءِ دَاوٗدَ(ع) لَا یَسْئَلُ الْبَیِّنَةَ وَ کُنْتَ اَرَدْتَّ اَنْ تَسْئَلَ لِحُمَّی الرِّبْعِ فَاُنْسِیْتَ فَاکْتُبْ فِیْ

[1] بحار الانوار، ج ۲، ص ۶۔

وَرَقَةٍ وَ عَلِقْهُ عَلَى الْمَحْمُوْمِ فَاِنَّهٗ يَبْرَأُ بِاِذْنِ اللّٰهِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ: ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ ﴾[1] فَعَلَّقْنَا عَلَيْهِ مَا ذَكَرَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ (ع) فَاَفَاقَ۔

میرے دل میں دو سوال تھے جن کا جواب جاننے کیلئے میں نے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے آپؑ کی خدمت میں ایک سوال یہ لکھا کہ جب حضرت امام مہدی علیہ السلام کا دور آئے گا تو آپؑ کس طرح قضاوت کریں گے اور آپؑ اپنی مسند قضا کہاں بچھائیں گے۔ اور دوسرا مجھے یہ ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھنا تھا جس کو ہر چوتھے دن بخار ہو جاتا تھا، مگر میں خط میں دوسرا سوال لکھنا بھول گیا۔ (کچھ دنوں بعد) جواب آیا جس میں لکھا تھا: تم نے حضرت قائم علیہ السلام کی قضاوت کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپؑ اپنے قیام کے بعد اپنے علم سے لوگوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی مانند فیصلے کریں گے جس میں گواہ طلب نہیں کئے جائیں گے۔ دوسرے تو نے چار دن میں ایک دن کے بخار میں سوال کرنا تھے جسے تم بھول گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کاغذ پر یہ آیہ مجیدہ ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ ﴾ لکھ کر اس بیمار کے گلے میں لٹکا دو تو ان شاء اللہ بخار جاتا رہے گا۔ راوی کہتا ہے کہ: ہم نے امامؑ کے حکم کے مطابق وہ آیہ مجیدہ لکھ کر اس میں گلے میں ڈالی تو وہ بیمار شفایاب ہو گیا۔[2]

امید ہے کہ خداوند متعال حضرت امام زمانہ علیہ السلام کے قلب مبارک کو ہم سے راضی وخوشنود فرمائے، آپؑ کے ظہور میں تعجیل فرمائے اور ہم سب کو امامؑ کے اعوان وانصار میں قرار دے۔ آمین!

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

✲✲✲✲✲

---

[1] سورۂ انبیاء، آیت ۶۹۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۵۰۹۔

حیاتِ پیغمبر اکرمؐ کے چند نمایاں پہلو[1]

مجمع التقریب

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ تمام انسانوں کیلئے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ اس مقالے میں آپؐ کی حیات طیبہ کے چند عملی نمونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ ہم سب انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا کر سعادت دارین حاصل کر سکیں۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- ۱۔ آپ کا دوسروں کے ساتھ برتاؤ
- ۲۔ آپؐ اپنی ذاتی روش اور سیرت

ذیل میں دونوں حوالوں سے مختصر تفصیل پیش خدمت ہے:

رسول اکرمؐ کا دوسروں سے برتاؤ

۱۔ چھوٹے بڑوں سب کو سلام:

رسول اکرم ﷺ کے برتاؤ میں گرمجوشی کشش اور متانت موجود تھی۔ چھوٹے، بڑے، فقیر اور غنی ہر ایک سے آپؐ کے ملنے جلنے میں وہ ادب نظر آتا ہے جو آپؐ کی عظمت اور وسیع النظری کو اجاگر کرتا ہے۔

آپ ﷺ چھوٹے بڑے ہر ایک سے ملنے کا آغاز سلام سے کرتے اور سبقت فرماتے تھے۔ قرآن کریم نے سلام کے جواب کیلئے جو آداب بیان کئے ہیں ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ سلام کا اچھے انداز سے جواب دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] بشکریہ از: عالمی مجلس برائے تقریب مذاہب اسلامی۔ (http://www.taqrib.info)

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۔﴾

اور جب کوئی شخص تمہیں سلام کرے تو تم بھی اس کے جواب میں بہتر طریقہ سے

سلام کرو یا وہی لفظ جواب میں کہہ دو۔[1]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کے جواب میں اس قرآنی ادب کی ایک خاص قسم کی ظرافت کو رعایت فرماتے تھے۔ جناب سلمان فارسیؓ سے منقول ہے کہ ایک شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور اس نے کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ!''، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ''وَعَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللهِ''، دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا: ''''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ وَ رَحْمَةُ اللهِ!'' آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''وَ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهٗ'' تیسرا شخص آیا اور اس نے کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهٗ''، آنحضرتؐ نے صرف فرمایا: ''وَ عَلَيْكَ'' اس شخص نے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ فلاں آپؐ کے پاس آئے اور انہوں نے سلام کیا تو آپؐ نے ان کے جواب میں میرے جواب سے زیادہ کلمات ارشاد فرمائے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے ہمارے واسطے کوئی چیز چھوڑی ہی نہیں۔ خداوند نے فرمایا ہے: ''اور جب کوئی شخص سلام کرے تو تم بھی اس کے جواب میں بہتر طریقہ سے سلام کیا کرو یا وہی لفظ جواب میں کہہ دیا کرو''۔[2]

۲۔ مصافحہ:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بہت اچھی سنت مصافحہ کرنا بھی ہے۔ آپؐ کے مصافحہ کے آداب کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَا صَافَحَ رَسُوْلُ اللهِ اَحَدًا قَطُّ فَنَزَعَ (ص) يَدَهٗ مِنْ يَدِهٖ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ

الَّذِيْ يَنْزِعُ يَدَهٗ۔

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے مصافحہ کیا ہو اور اس شخص سے

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۸۶۔

[2] المجازات النبویہ، ص ۲۸۵۔

پہلے آپؐ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہو۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ: ''جب لوگوں نے اس بات کو سمجھ لیا تو حضرتؐ سے مصافحہ کرنے میں جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتے تھے''۔

رخصت کے وقت

مومنین کو رخصت کرتے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کیلئے دُعائے خیر کیا کرتے تھے۔ ان کو خیر و نیکی کے مرکب پر بٹھاتے اور تقویٰ کا توشہ ان کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک صحابی کو رخصت کرتے وقت فرمایا:

زَوَّدَكَ اللهُ التَّقْوٰى وَ غَفَرَ ذَنْبَكَ وَ لَقَّاكَ الْخَيْرَ حَيْثُ كُنْتَ۔

خداوند عالم تقویٰ کو تمہارا زادہ قرار دے، تمہارے گناہ معاف کردے اور تم جہاں کہیں بھی رہو تم تک خیر پہنچا تا رہے۔[2]

۳۔ پکارتے وقت:

اصحاب کو پکارنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انداز نہایت محترمانہ ہوتا تھا۔ آپؐ اپنے اصحابؓ کے احترام اور ان کے قلبی لگاؤ کیلئے ان کو کنیت سے پکارتے تھے اور اگر کسی کی کوئی کنیت نہیں ہوتی تھی تو اس کیلئے خود سے کوئی کنیت معین کردیتے تھے جس پر دوسرے لوگ بھی اسی کنیت سے ان کو پکارنے لگتے تھے۔ اسی طرح بے اولاد عورتوں، یہاں تک کہ بچوں کیلئے کنیت معین فرماتے تھے اور اس طرح سب کا دل موہ لیتے تھے۔

۴۔ پکار کا جواب:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح کسی کو پکارنے میں اس کے احترام کو ملحوظ نظر رکھتے تھے ویسے ہی آپؐ کسی کی آواز کا جواب دینے میں بھی آپؐ کے الفاظ کسر نفسی اور احترام کے جذبات سے ملے جلے ہوتے تھے۔ روایت میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی ان کے اصحاب میں سے کسی نے یا کسی غیر نے

---

[1] مکارم الاخلاق، ص ۲۳۔

[2] مکارم الاخلاق، ص ۲۴۹۔

پکارا تو آپؐ نے اس کے جواب میں لبیک کہا۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی شخص کسی چیز کی خواہش کرتا تھا اور آپ بھی اسے انجام دینا چاہتے تو فرماتے تھے کہ ''ہاں'' اور اگر اس کو انجام دینا نہیں چاہتے تھے تو خاموش رہ جاتے تھے اور ہرگز ''نہیں'' کا لفظ زبان پر جاری نہیں کرتے تھے۔

۵۔ظاہری آرائش:

کچھ لوگ مردوں کا فقط گھر کے باہر اور نا آشنا لوگوں سے ملاقات کرتے وقت آراستہ رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے برخلاف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں اور گھر کے باہر دونوں جگہ نہایت آراستہ رہتے تھے۔نہ صرف اپنے خاندان والوں کیلئے بلکہ اپنے اصحاب کیلئے بھی اپنے کو آراستہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ: خدا اپنے اس بندہ کو دوست رکھتا ہے جو اپنے بھائیوں سے ملاقات کیلئے گھر سے نکلتے وقت تیار اور آراستہ ہو کر نکلے۔

۶۔مہمان نوازی کے آداب:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مہمانوں کا نہایت احترام و اکرام کرتے تھے۔منقول ہے کہ جب کبھی کوئی آپؐ کے پاس آتا تھا تو جس مسند پر آپؐ خود تشریف فرما ہوتے تھے، آنے والے شخص کو دے دیتے تھے اور اگر وہ مہمان اسے قبول نہیں کرتا تو آپؐ اصرار فرماتے تھے یہاں تک وہ قبول کر لے۔

حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام بیان فرماتے ہیں کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں کوئی مہمان آتا تھا تو آپؐ اس کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور جب تک مہمان کھانے سے اپنا ہاتھ روک نہیں لیتا تھا، آپؐ کھانے میں اس کے ساتھ شریک رہتے تھے۔

۷۔عیادت کے آداب:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے صحت و تندرستی ہی کے زمانہ میں ملاقات نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر کوئی مومن اتفاقاً بیمار پڑ جاتا تو آپ اس کی عیادت کو جاتے اور یہ عمل خاص آداب کے ساتھ انجام پاتا۔

عیادت کے آداب سے متعلق آپ کا فرمان ہے:

تَمَامُ عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ اَنْ يَّضَعَ اَحَدُكُمْ يَدَهٗ عَلَيْهِ وَ يَسْئَلَهٗ كَيْفَ اَنْتَ؟

كَيْفَ اَصْبَحْتَ وَ كَيْفَ اَمْسَيْتَ؟۔

مریض کی عیادت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھو اس سے پوچھو

کہ تم کیسے ہو؟ رات کیسے گزاری؟ تمہارا دن کیسے گزرا؟۔[1]

مریض کی عیادت کے وقت رسول خدا ﷺ کا ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ اس کیلئے دُعا فرماتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ جناب سلمان فارسیؓ بیمار ہوئے اور آپؐ نے ان کی عیادت کی تو اٹھتے وقت فرمایا:

يَا سَلْمَانُ! كَشَفَ اللّٰهُ ضُرَّكَ وَ غَفَرَ ذَنْبَكَ وَ حَفِظَكَ فِيْ دِيْنِكَ وَ بَدَنِكَ اِلٰى مُنْتَهٰى اَجَلِكَ۔

اے سلمان! اللہ تمہاری پریشانی کو دور کرے، تمہارے گناہوں کو بخش دے اور

موت آنے تک تمہارے دین اور بدن کو صحیح وسالم رکھے۔[2]

حاصل کلام

پیغمبر اکرم ﷺ کے برتاؤ کے آداب کی خصوصیات میں دائمی شائستگی نمایاں تھی۔ آنحضرتؐ کے سلوک کا اثر آپؐ کے زمانے کے افراد پر ایسا گہرا تھا کہ بہت ہی کم مدت میں ان کی روح وفکر میں عظیم تبدیلی آگئی اور ان کو آپؐ نے اخلاق اسلامی کے زیور سے آراستہ کر دیا۔ رسول اکرمؐ کی سیرت کو نمونہ عمل بنانا فقط آپؐ کے زمانہ کے افراد سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ جب تک دنیا قائم ہے اور اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے، رسول اسلام ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کو چاہیے کہ آپؐ کے اخلاق، آداب اور سیرت کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

---

[1] مکارم الاخلاق، ص ۳۵۹۔۳۶۰۔

[2] مکارم الاخلاق، ص ۳۶۱۔

اپنی ذات کے حوالے سے آداب

انفرادی اور ذاتی اعمال کی انجام دہی میں آپ ﷺ کا طریقہ اس حد تک دلکش اور پسندیدہ تھا کہ لوگوں کیلئے ہمیشہ کیلئے نمونہ عمل بن گئے۔ آپؐ پر ایمان لانے والے آج سنت نبوی سمجھ کر ان اعمال کو بجالاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کی تاریخ میں کوئی چھوٹی سی ناپسندیدہ بات بھی نظر نہیں آتی۔ صرف بڑے کاموں میں ہی آپؐ کی سیرت سبق آموز اور نمونہ عمل نہیں ہے، بلکہ آپؐ کی زندگی کے معمولی اور جزئی امور بھی اخلاق کے دقیق اور لطیف ترین درس دیتے نظر آتے ہیں:

ا۔ زینت و آرائش:

دنیاوی زرق و برق کی نسبت آپ ﷺ نظافت، صفائی اور پاکیزگی کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اچھی خوشبو استعمال کرتے تھے، بالوں میں کنگھی کرتے تھے اور آپ کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا اور پاکیزہ رہتا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت آئینہ دیکھتے، ہمیشہ باوضو رہتے اور مسواک کرتے تھے۔ آپؐ کے لباس اور نعلین کا ایک رنگ ہوتا تھا۔ جب آپ سر پر عمامہ رکھتے تو اس وقت آپ کا قد نمایاں ہو کر آپؐ کے وقار میں چار چاند لگا دیتا تھا۔

۲۔ کھانے کے آداب:

رسول خدا ﷺ مخصوص آداب سے کھانا تناول فرماتے تھے، لیکن کوئی مخصوص غذا نہیں کھاتے تھے۔ آپ ﷺ ہر طرح کی غذا نوش فرماتے تھے اور جس کھانے کو خدا نے حلال کیا ہے، اس کو اپنے گھر والوں اور خدمتگاروں کے ساتھ کھاتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپؐ کی دعوت کرتا تو آپؐ زمین یا فرش پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ پکا ہوتا تھا تناول فرما لیتے تھے، لیکن جب آپؐ کے یہاں کوئی مہمان آجاتا تو آپؐ اس کے ساتھ غذا تناول فرماتے اور اس غذا کو بہترین تصور فرماتے تھے جس میں آپؐ کے ساتھ زیادہ لوگ شریک ہوتے تھے۔ کسی کھانے کی مذمت نہیں کرتے تھے، پسند آتا تو کھا لیتے اور اگر ناپسند ہوتا تو نہیں کھاتے تھے، لیکن اسے دوسروں کیلئے حرام نہیں کرتے تھے۔

۳۔کم خوری:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن بھر کی انتھک محنت اور ہمیشہ نماز شب کی ادائیگی کے باوجود کم غذا تناول فرماتے اور پرخوری سے پرہیز کرتے تھے۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَا كَانَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى رَسُوْلِ اللهِ (ص) مِنْ اَنْ يَظَلَّ جَآئِعًا خَآئِفًا فِيْ اللهِ۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اس سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہ تھی کہ ہمیشہ بھوک رہے اور خوف خدا دل میں رکھا جائے۔[1]

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے تھے:

اَهْضَمُ اَهْلِ الدُّنْيَا كَشْحًا وَّ اَخْمَصُهُمْ مِنَ الدُّنْيَا بَطْنًا۔۔۔ خَرَجَ مِنَ الدُّنْيَا خَمِيْصًا وَّ وَرَدَ الْاٰخِرَةَ سَلِيْمًا۔

شکم کے اعتبار سے آپؐ سب سے زیادہ لاغر اور کھانے کے اعتبار سے آپ سب سے زیادہ بھوک میں رہتے تھے۔۔۔آپ بھوکے پیٹ کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے اور منزل آخرت میں صحیح وسالم پہنچے۔[2]

۳۔بیٹھنے کے آداب:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے مخلص بندے تھے۔آپؐ ہر حال میں حق تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

مَا اَكَلَ رَسُوْلُ اللهِ (ص) مُتَّكِئًا مُنْذُ بَعَثَهُ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ اِلٰى اَنْ قَبَضَهُ وَ كَانَ يَاْكُلُ اِكْلَةَ الْعَبْدِ وَ يَجْلِسُ جِلْسَةَ الْعَبْدِ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔آپؐ غلاموں کی طرح کھانا کھاتے تھے اور غلاموں کی طرح

---

[1] الکافی، ج ۸، ص ۱۲۹۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۶۰۔

زمین پر بیٹھتے تھے۔[1]

۴۔ہاتھ سے غذا کھانا:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کھانے کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ کھانا ہاتھ سے کھاتے تھے۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کی طرح بیٹھتے تھے، ہاتھوں کو زمین پر رکھتے اور تین انگلیوں سے غذا نوش فرماتے تھے۔ نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تھے تو اپنی انگلیوں کو چوستے تھے۔[2]

۵۔کھانا کھانے کی مدت:

تھوڑی سی غذا پر قناعت فرمانے کے باوجود جو افراد آپؐ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، آپؐ شروع سے آخر تک ان کا ساتھ دیتے تھے، تاکہ وہ لوگ آپؐ کی خاطر کھانے سے ہاتھ نہ کھینچ لیں اور بھوکے ہی نہ رہ جائیں۔صادق آل محمدؐ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (ص) کَانَ اِذَا اَتَاہُ الضَّیْفُ اَکَلَ مَعَہٗ وَلَمْ یَرْفَعْ یَدَہٗ مِنَ الْخِوَانِ حَتّٰی یَرْفَعَ الضَّیْفُ یَدَہٗ۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کیلئے بیٹھتے تو سب سے پہلے شروع کرتے اور سارے لوگوں کے بعد کھانے سے ہاتھ روکتے تاکہ لوگ کھانے سے فارغ ہوجائیں۔[3]

۶۔ہر لقمہ کے ساتھ حمد خدا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ کسی بھی لمحہ یاد خدا سے غافل نہیں رہتے تھے، اس لئے کھانا کھاتے وقت بھی خدا کا شکر ادا کرتے رہتے تھے منقول ہے کہ رسول خداؐ ہر دو لقمہ کے درمیان حمد خدا کیا کرتے تھے۔

---

[1] الکافی، ج۶، ص۲۷۰۔

[2] مکارم الاخلاق، ص۲۸۔

[3] الکافی، ج۶، ص۲۸۶۔ سنن النبیؐ، ص۱۶۴۔

۷۔ پانی پینے کا انداز:

پیغمبر اکرم ﷺ پانی پیتے وقت بھی ایک خاص ادب کا خیال رکھتے تھے۔ روایت میں ہے کہ جب پانی پیتے تو بسم اللہ کہتے۔۔۔ پانی کو چوس کر پیتے اور ایک سانس میں نہیں پیتے تھے۔ اس بارے میں فرماتے تھے کہ ایک سانس میں پانی پینے سے تلی میں درد پیدا ہوتا ہے۔[1]

روایت میں یہ بھی ہے: آپ ﷺ پانی پیتے وقت پانی کے برتن ہی میں سانس نہیں لیتے تھے، بلکہ سانس لینا چاہتے تو برتن کو منہ سے الگ کر لیتے تھے۔[2]

۸۔ سفر کے آداب:

جنگ اور جنگ کے علاوہ آپ ﷺ کے دونوں سفر مخصوص آداب کے ساتھ انجام پاتے تھے اور آپؐ تمام ضروری باتوں کا خیال رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر آپؐ ضروری سامان اپنے ساتھ لے لیتے تھے۔ زادِراہ کے بارے میں آپؐ فرماتے ہیں: یہ سنت ہے کہ جب کوئی سفر کیلئے نکلے تو اپنا خرچ اور اپنی غذا اپنے ساتھ رکھے۔ اس لئے کہ یہ عمل پاکیزگیٔ نفس اور اخلاق کے اچھے ہونے کا باعث ہے۔

زادراہ کے علاوہ آپؐ اپنی ذاتی ضروریات کا سامان بھی اپنے ساتھ لے لیتے تھے۔ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر میں چند چیزیں اپنے ساتھ ضرور رکھتے تھے: آئینہ، تیل، سرمہ دانی، قینچی، مسواک اور کنگھی۔ ایک اور مقام پر مروی ہے کہ سوئی دھاگہ، نعلین سینے والی سوئی اور پیوند لگانے کی چیزیں بھی آپؐ اپنے ساتھ رکھتے تاکہ لباس کو اپنے ہاتھوں سے سی لیں اور جوتے میں پیوند لگا لیں۔

آنحضرت ﷺ کے سفر کے آداب میں ایک دوسری چیز کا بھی ذکر آیا ہے اور وہ یہ کہ آپ جس راستے سے جاتے تھے اس راستے سے واپس نہیں آتے تھے بلکہ دوسرا راستہ اختیار کرتے تھے۔

سفر کے دوران آپؐ تیز قدم اٹھاتے اور راستہ جلد طے کرتے اور جب وسیع و عریض بیابان میں پہنچتے تو اپنی رفتار مزید تیز کر دیتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ سفر سے ظہر کے وقت واپس پلٹتے۔ جب آپؐ سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد جاتے، دو رکعت نماز پڑھتے اور اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے تھے۔

---

[1] سنن النبیؐ، ص ۱۶۹۔

[2] سنن النبیؐ، ص ۱۷۰۔

۹۔سونے کے آداب:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم کے مطابق راتوں کو بیدار اور دُعا و عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ فقط تھوڑی دیر سوتے وہ بھی مخصوص آداب کے ساتھ۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَا اسْتَيْقَظَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) مِنْ نَوْمٍ اِلَّا خَرَّ لِلّٰهِ سَاجِدًا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی خواب سے بیدار ہوتے تو اسی وقت زمین پر خدا کا سجدہ بجالاتے تھے۔[1]

آپ کا فرش پر بچھانے کیلئے ایک عبا اور ایک کھال کا تکیہ تھا کہ جس میں خرمہ کی چھال بھری ہوئی تھی۔ایک رات اسی بستر کو دوہرا کر کے لوگوں نے بچھا دیا۔جب آپ صبح کو بیدار ہوئے تو فرمایا کہ یہ بستر نماز شب سے روکتا ہے۔اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ اس کو پہلے کی طرح اکہرا بچھایا جائے۔

*****

برادر مومن سے برے سلوک کا انجام

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ غَشَّ اَخَاهُ وَ حَقَّرَهٗ وَ نَاوَاهُ جَعَلَ اللّٰهُ النَّارَ مَأْوَاهُ وَ مَنْ حَسَدَ مُؤْمِنًا انْمَاثَ الْاِيْمَانُ فِيْ قَلْبِهٖ كَمَا يَنْمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَآءِ۔

جس شخص نے اپنے مومن بھائی کو دھوکہ دیا، اسے حقارت کی نظر سے دیکھا یا اس کے ساتھ نزاع کی، خداوند متعال آگ کو اس کا ٹھکانہ قرار دے گا اور جس نے اپنے مومن بھائی سے حسد کیا اس کے دل سے ایمان اس طرح زائل ہو جائے گا جیسے نمک پانی میں زائل ہو جاتا ہے۔

(تحف العقول، ص ۳۰۳)

---

[1] سنن النبیؐ، ص ۱۴۰۔

خصائص علوم اہل بیتؑ (۲)

قسط:20

از: آیت اللہ محمد محمدی ری شہری

ترجمہ: علامہ ذیشان حیدر جوادی

۵۔ پرندوں اور حیوانوں کی زبان کا علم:

[33] اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ: عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ کَمَا عُلِّمَهٗ سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ. وَکُلِّ دَابَّةٍ فِیْ بَرٍّ اَوْ بَحْرٍ۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ہمیں پرندوں کی زبان کا اسی طرح علم دیا گیا ہے جیسے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو دیا گیا ہے اور ہم بر و بحر کے تمام جانوروں کی زبان جانتے ہیں۔[1]

[34] عَنْهُ عَلَیْهِ السَّلَامُ: عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ. وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ. اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْعَظِیْمُ۔

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: ہمیں پرندوں کی گفتگو اور ہر شے کا علم دیا گیا جو خدا کا عظیم فضل ہے۔[2]

[35] عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ حَمْزَةَ: دَخَلَ رَجُلٌ مِّنْ مَّوَالِیْ اَبِی الْحَسَنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَقَالَ: جُعِلْتُ فِدَاكَ! اُحِبُّ اَنْ تَتَغَدَّی عِنْدِیْ. فَقَامَ اَبُو الْحَسَنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ حَتّٰی مَضٰی مَعَهٗ فَدَخَلَ الْبَیْتَ. فَاِذَا فِی الْبَیْتِ سَرِیْرٌ. فَقَعَدَ عَلَی السَّرِیْرِ. وَتَحْتَ السَّرِیْرِ زَوْجُ حَمَامٍ. فَهَدَرَ الذَّکَرُ عَلَی الْاُنْثٰی. وَذَهَبَ الرَّجُلُ لِیَحْمِلَ الطَّعَامَ فَرَجَعَ وَاَبُو الْحَسَنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَضْحَكُ. فَقَالَ: اَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ. مِمَّ ضَحِكْتَ؟ فَقَالَ: اِنَّ هٰذَا الْحَمَامَ هَدَرَ عَلٰی هٰذِهِ الْحَمَامَةِ فَقَالَ لَهَا: یَا سَکَنِیْ وَعِرْسِیْ! وَاللّٰهِ مَا عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْكِ. مَا خَلَا هٰذَا الْقَاعِدَ عَلَی السَّرِیْرِ. قَالَ: قُلْتُ: جُعِلْتُ فِدَاكَ! وَتَفْهَمُ کَلَامَ الطَّیْرِ؟ فَقَالَ: نَعَمْ. عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ. وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۲، ص ۵۴۔ بصائر الدرجات، ص ۳۴۳، حدیث ۱۲۔

[2] اثبات الوصیۃ، ص ۱۶۰۔ الاختصاص، ص ۱۹۳۔

علی بن ابی حمزہ روایت کرتے ہیں: حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ایک غلام نے آکر حضرتؑ سے درخواست کی کہ میرے ساتھ گھر کھانا تناول فرمائیں۔ حضرتؑ اٹھے اور اس کے ساتھ گھر تشریف لے گئے۔ اس کے گھر میں ایک تخت رکھا تھا جس پر آپؑ بیٹھ گئے۔ اس تخت کے نیچے کبوتر کا ایک جوڑا تھا۔ نر کبوتر مادہ سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ غلام کھانا لانے چلا گیا اور جب پلٹ کر آیا تو حضرتؑ مسکرا رہے تھے۔ اس نے عرض کی: حضورؑ! ہمیشہ مسکراتے رہیں! اس وقت ہنسنے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: یہ کبوتر کبوتری سے اظہار محبت کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ: تو میری محبوبہ ہے اور مجھے کائنات میں تجھ سے زیادہ پیارا کوئی نہیں ہے سوائے اس شخص کے جو اس تخت کے اوپر تشریف فرما ہے۔ غلام نے عرض کی: حضورؑ! کیا آپؑ پرندوں کی زبان سمجھتے ہیں؟ فرمایا: بیشک ہمیں پرندوں کی زبان اور دنیا کی ہر شے کا علم دیا گیا ہے۔[1]

[36] عَلِيُّ بْنُ اَسْبَاطٍ: خَرَجْتُ مَعَ اَبِيْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْكُوْفَةِ وَهُوَ رَاكِبٌ عَلٰى حِمَارٍ، فَمَرَّ بِقَطِيْعِ غَنَمٍ. فَتَرَكَتْ شَاةٌ الْغَنَمَ وَعَدَتْ اِلَيْهِ وَهِيَ تَرْغُوْ. فَاحْتَبَسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاَمَرَنِيْ اَنْ اَدْعُوَ الرَّاعِيَ اِلَيْهِ. فَفَعَلْتُ. فَقَالَ اَبُوْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَيُّهَا الرَّاعِيْ! اِنَّ هٰذِهِ الشَّاةَ تَشْكُوْكَ وَتَزْعُمُ اَنَّ لَهَا رَجَلَيْنِ وَاَنَّكَ تَحِيْفُ عَلَيْهَا بِالْحَلْبِ. فَاِذَا رَجَعَتْ اِلٰى صَاحِبِهَا بِالْعَشِيِّ لَمْ يَجِدْ مَعَهَا لَبَنًا. فَاِنْ كَفَفْتَ مِنْ ظُلْمِهَا. وَاِلَّا دَعَوْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْ يَبْتُرَ عُمُرَكَ. فَقَالَ الرَّاعِيْ: اِنِّيْ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ اَنَّكَ وَصِيُّهٗ. اَسْئَلُكَ لَمَّا اَخْبَرْتَنِيْ مِنْ اَيْنَ عَلِمْتَ هٰذَا الشَّانَ؟ فَقَالَ اَبُوْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ: نَحْنُ خُزَّانُ اللّٰهِ عَلٰى عِلْمِهٖ وَغَيْبِهٖ وَحِكْمَتِهٖ. وَاَوْصِيَآءُ اَنْبِيَآئِهٖ. وَعِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔

علی بن اسباط کہتے ہیں: میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ کوفہ سے باہر نکلا۔ آپؑ ایک گدھے پر سوار تھے۔ کچھ دور جا کر ایک بھیڑوں کے گلے کے قریب سے گزرے تو ایک بکری ریوڑ سے الگ ہو کر دوڑتی اور شور مچاتی ہوئی آپؑ کے پاس آئی۔ آپ ٹھہر گئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کے چرواہے کو بلاؤں۔ میں نے اسے حاضر کر دیا۔ آپؑ نے اس سے فرمایا: یہ بکری تمہاری شکایت کر رہی ہے کہ اسے دو بار اپنے بچوں کو دودھ پلانا ہوتا ہے اور تم اس پر ظلم کر کے سارا دودھ دوہ لیتے ہو تو جب شام کو گھر واپس جاتی ہے تو مالک کیلئے کچھ دودھ نہیں بچتا۔ تو اس پر ظلم کرنے سے باز آجا ورنہ میں تیری عمر کم ہونے کی

---

[1] بصائر الدرجات، ص ۳۴۶، حدیث ۲۵۔ الخرائج والجرائح، ج ۲، ص ۸۳۳، حدیث ۴۹۔ الاختصاص، ص ۲۹۳۔

بددُعا کردوں گا؟ یہ سن کر چرواہا فوراً بول اٹھا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپؑ ان کے برحق وصی ہیں۔ اس نے عرض کی: مولا! آپؑ کو یہ علم کہاں سے ملا ہے؟ فرمایا: ہم علم غیب وحکمت الٰہی کے خزانہ دار، انبیاءؑ کے وصی اور اللہ کے محترم بندے ہیں۔[1]

[37] عَبْدُ اللهِ بْنُ سَعِيْدٍ: قَالَ لِيْ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَ التَّنُوْخِيُّ: رَاَيْتُ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيٍّ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ وَهُوَ يُكَلِّمُ ثَوْرًا فَحَرَّكَ الثَّوْرُ رَاْسَهُ. فَقُلْتُ: لَا. وَلٰكِنْ تَاْمُرُ الثَّوْرَ اَنْ يُكَلِّمَكَ. فَقَالَ: وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ. وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ. ثُمَّ قَالَ لِلثَّوْرِ: قُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ. فَقَالَ. ثُمَّ مَسَحَ بِكَفِّهِ عَلٰى رَاْسِهِ۔

عبداللہ بن سعید کہتے ہیں: مجھ سے محمد بن علی بن عمر تنوخی نے بیان کیا ہے کہ: میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو ایک بیل سے بات کرتے دیکھا جس کو سن کر وہ سر ہلا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں اس طرح نہ مانوں گا جب تک آپ اسے یہ حکم نہ دیں کہ وہ آپؑ سے کلام کرے؟ آپؑ نے فرمایا: ہمیں پرندوں کی زبان اور ہر شے کا علم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بیل کو حکم دیا کہ لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ کہے، اس نے فوراً کہہ دیا اور آپؑ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔[2]

۶۔ ماضی و مستقبل کا علم:

[38] اَلْاِمَامُ عَلِيٌّ (ع): لَوْلَا اٰيَةٌ فِيْ كِتَابِ اللهِ لَاَخْبَرْتُكُمْ بِمَا كَانَ وَبِمَا يَكُوْنُ وَمَا هُوَ كَآئِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. وَهِيَ هٰذِهِ الْاٰيَةُ: ﴿يَمْحُوا اللهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾[3]۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اگر قرآن مجید میں یہ آیت نہ ہوتی جس میں ارشاد ہے: ''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس امّ الکتاب ہے''، تو میں تمہیں تمام گزشتہ اور آئندہ قیامت تک ہونے والے سب حالات سے باخبر کر دیتا۔[4]

[39] اَلْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَللّٰهُمَّ يَا مَنْ اَعْطَانَا عِلْمَ مَا مَضٰى وَمَا بَقِيَ. وَجَعَلَنَا

---

[1] الثاقب فی المناقب، ص ۵۲۲، حدیث ۲۵۵۔

[2] دلائل الامامۃ، ص ۴۰، حدیث ۳۵۶۔

[3] سورۂ رعد، آیت ۳۹۔

[4] التوحید، ص ۳۰۵، حدیث ۱۔ امالی شیخ صدوقؒ، ص ۲۸۰، حدیث ۱۔ الاختصاص، ص ۲۳۵۔ الاحتجاج، ج ۱، ص ۶۱۰۔ تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۲۱۵، حدیث ۵۹۔ قرب الاسناد، ص ۳۵۴، حدیث ۱۲۶۶۔

وَرَثَةَ الْاَنْبِيَآءِ. وَخَتَمَ بِنَا الْاُمَمَ السَّالِفَةَ. وَخَصَّنَا بِالْوَصِيَّةِ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: اے وہ خدا جس نے ہم کو تمام ماضی اور آئندہ کا علم دیا ہے اور انبیاءؑ کے علم کا وارث بنایا ہے، ہم پر تمام گزشتہ امتوں کا سلسلہ ختم کیا ہے اور پیغمبروں کی جانشینی کو ہمارے ساتھ مخصوص کیا ہے۔[1]

[40] مُعَاوِيَةُ بْنُ وَهْبٍ: اِسْتَاْذَنْتُ عَلٰى اَبِيْ عَبْدِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقِيْلَ لِيْ: اُدْخُلْ. فَدَخَلْتُ فَوَجَدْتُهٗ فِيْ مُصَلَّاهُ فِيْ بَيْتِهٖ. فَجَلَسْتُ حَتّٰى قَضٰى صَلَاتَهٗ. فَسَمِعْتُهٗ وَهُوَ يُنَاجِيْ رَبَّهٗ وَيَقُوْلُ: يَا مَنْ خَصَّنَا بِالْكَرَامَةِ. وَخَصَّنَا بِالْوَصِيَّةِ. وَوَعَدَنَا الشَّفَاعَةَ. وَاَعْطَانَا عِلْمَ مَا مَضٰى وَمَا بَقِيَ. وَجَعَلَ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْنَا. اِغْفِرْ لِيْ وَلِاِخْوَانِيْ وَلِزُوَّارِ قَبْرِ اَبِيْ (عَبْدِ اللهِ) الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔

معاویہ بن وہب کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دروازہ پر اجازت طلب کی اور اجازت ملنے کے بعد گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرتؑ مصلّی پر ہیں۔ میں ٹھہر گیا۔ جب نماز تمام ہوگئی تو دیکھا آپؑ یہ مناجات کر رہے تھے: ''اے وہ پروردگار! جس نے ہمیں کرامت اور انبیاء کی جانشینی کیلئے مخصوص فرمایا اور ہم سے شفاعت کا وعدہ کیا ہے اور ہمیں تمام ماضی اور مستقبل کا علم عطا فرمایا ہے اور کچھ لوگوں کے دلوں کو ہماری طرف موڑ دیا ہے۔ خدایا! ہمیں اور ہمارے برادران ایمانی کو اور قبر امام حسینؑ کے تمام زائروں کو بخش دے۔[2]

[41] سَيْفٌ التَّمَّارُ: كُنَّا مَعَ اَبِيْ عَبْدِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ جَمَاعَةً مِّنَ الشِّيْعَةِ فِي الْحِجْرِ.... فَقَالَ: وَرَبِّ الْكَعْبَةِ! وَرَبِّ الْبَنِيَّةِ!۔ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ لَوْ كُنْتُ بَيْنَ مُوْسٰى وَالْخِضْرِ لَاَخْبَرْتُهُمَا اَنِّيْ اَعْلَمُ مِنْهُمَا. وَلَاَنْبَاْتُهُمَا بِمَا لَيْسَ فِيْ اَيْدِيْهِمَا. لِاَنَّ مُوْسٰى وَالْخِضْرَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ اُعْطِيَا عِلْمَ مَا كَانَ وَلَمْ يُعْطَيَا عِلْمَ مَا يَكُوْنُ وَمَا هُوَ كَآئِنٌ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ. وَقَدْ وَرِثْنَاهُ مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وِرَاثَةً۔

سیف تمار کا بیان ہے: میں ایک جماعت کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں

---

[1] بصائر الدرجات، ص ۱۲۹، حدیث ۳۔

[2] الکافی، ج ۴، ص ۵۸۲، حدیث ۱۱۔ کامل الزیارات، ص ۱۱۶۔

حاضر تھا۔ آپؑ نے تین مرتبہ خانہ کعبہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ اگر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب خضر علیہ السلام کے درمیان حاضر ہوتا تو دونوں کو بتاتا کہ میں ان سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور انہیں وہ باتیں بتاتا جو ان کے پاس نہیں تھیں، اس لئے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کو گزشتہ باتوں کا علم دیا گیا تھا، انہیں مستقبل اور قیامت تک کے حالات کا علم نہیں دیا گیا تھا اور ہمیں رسول اللہ کی وراثت سے ان سب کا علم عطا ہوا ہے۔[1]

[42] اَلْحَارِثُ بْنُ الْمُغِيْرَةِ عَنِ الْإِمَامِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنِّيْ لَاَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَاَعْلَمُ مَا فِي الْجَنَّةِ، وَاَعْلَمُ مَا فِي النَّارِ، وَاَعْلَمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ. ثُمَّ مَكَثَ هُنَيْئَةً فَرَاٰى اَنَّ ذٰلِكَ كَبُرَ عَلٰى مَنْ سَمِعَهٗ مِنْهُ. فَقَالَ: عَلِمْتُ ذٰلِكَ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ. اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: فِيْهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ۔

حارث بن مغیرہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: میں آسمان و زمین کی تمام اشیاء، جنت و جہنم کی تمام اشیاء، ماضی اور مستقبل کی تمام اشیاء کا علم رکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپؑ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔ آپؑ کو یوں لگا کہ سننے والوں کو یہ بات بڑی لگ رہی ہے۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا: یہ سب مجھے کتاب خدا سے معلوم ہوا ہے کیونکہ اس میں ہر شے کا بیان پایا جاتا ہے۔[2]

[43] اَلْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: قَدْ وَلَدَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَاَنَا اَعْلَمُ كِتَابَ اللّٰهِ وَفِيْهِ بَدْءُ الْخَلْقِ، وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَفِيْهِ خَبَرُ السَّمَآءِ وَخَبَرُ الْاَرْضِ، وَخَبَرُ الْجَنَّةِ وَخَبَرُ النَّارِ، وَخَبَرُ مَا كَانَ (وَخَبَرُ) مَا هُوَ كَائِنٌ. اَعْلَمُ ذٰلِكَ كَمَآ اَنْظُرُ اِلٰى كَفِّيْ. اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: فِيْهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ہم اولاد رسولؐ اس عالم میں پیدا ہوئے ہیں کہ ہمیں اللہ کی کتاب، ابتدائے آفرینش اور قیامت تک کے حالات کا علم تھا اور اس کتاب میں آسمان و زمین، جنت و جہنم، ماضی و مستقبل سب کا علم موجود ہے اور ہمیں اس طرح معلوم ہے جس طرح ہاتھ کی ہتھیلی، کیونکہ اللہ کے فرمان کے مطابق قرآن مجید میں ہر شے کا بیان موجود ہے۔[3]

---

[1] الکافی، ج ۱، ص ۲۶۰، حدیث ۱۔ بصائر الدرجات، ص ۱۲۹، حدیث ۱۔ دلائل الامامۃ، ص ۲۸۰، حدیث ۲۱۸۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۲۶۱، حدیث ۲۔ بصائر الدرجات، ص ۱۲۸، حدیث ۵۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۲۴۹۔

[3] الکافی، ج ۱، ص ۶۱، حدیث ۸۔ ینابیع المودۃ، ج ۱، ص ۸۰، حدیث ۲۰۔ تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۲۶۶، حدیث ۶۵۔

[44] اَلْاِمَامُ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَوَلَيْسَ اللهُ يَقُوْلُ: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾[1]؟ فَرَسُوْلُ اللهِ عِنْدَ اللهِ مُرْتَضًى، وَنَحْنُ وَرَثَةُ ذٰلِكَ الرَّسُوْلِ الَّذِيْ اطْلَعَهُ اللهُ عَلٰى مَا شَآءَ مِنْ غَيْبِهٖ، فَعَلَّمَنَا مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب کا اظہار صرف اپنے پسندیدہ بندوں پر کرتا ہے''۔ پس رسول اکرمؐ اس کے پسندیدہ بندہ تھے اور ہم سب انہی کے وارث ہیں جن کو خدا نے اپنے غیب پر مطلع فرمایا ہے اور تمام ماضی اور مستقبل کا علم دیا ہے۔[2]

[45] عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْهَاشِمِيُّ: دَخَلْتُ عَلَى الْمَأْمُوْنِ يَوْمًا، فَاَجْلَسَنِيْ وَاَخْرَجَ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ، ثُمَّ دَعَا بِالطَّعَامِ فَطَعِمْنَا، ثُمَّ طَيَّبَنَا، ثُمَّ اَمَرَ بِسِتَارَةٍ فَضُرِبَتْ، ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰى بَعْضِ مَنْ كَانَ فِي السِّتَارَةِ فَقَالَ: بِاللهِ! لَمَا رَثَيْتَ لَنَا مَنْ بِطُوْسَ! فَاَخَذْتُ اَقُوْلُ:

سَقْيًا بِطُوْسَ وَ مَنْ اَضْحٰى بِهَا قَطَنَا مِنْ عِتْرَةِ الْمُصْطَفٰى اَبْقٰى لَنَا حَزَنًا

قَالَ: ثُمَّ بَكٰى وَقَالَ لِيْ: يَا عَبْدَ اللهِ! اَيَلُوْمُنِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ وَاَهْلُ بَيْتِكَ اَنْ نَصَبْتُ اَبَا الْحَسَنِ الرِّضَا عَلَمًا؟! فَوَاللهِ! لَاُحَدِّثُكَ بِحَدِيْثٍ تَتَعَجَّبُ مِنْهُ. جِئْتُهٗ يَوْمًا فَقُلْتُ لَهٗ: جُعِلْتُ فِدَاكَ! اِنَّ اٰبَآءَكَ مُوْسَى بْنَ جَعْفَرٍ، وَجَعْفَرَ بْنَ مُحَمَّدٍ، وَمُحَمَّدَ بْنَ عَلِيٍّ، وَعَلِيَّ بْنَ الْحُسَيْنِ كَانَ عِنْدَهُمْ عِلْمُ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَآئِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَاَنْتَ وَصِيُّ الْقَوْمِ وَوَارِثُهُمْ، وَعِنْدَكَ عِلْمُهُمْ، وَقَدْ بَدَتْ لِيْ اِلَيْكَ حَاجَةٌ. قَالَ: هَاتِهَا. فَقُلْتُ: هٰذِهِ الزَّاهِرِيَّةُ حَظِيَّتِيْ، وَلَا اُقَدِّمُ عَلَيْهَا مِنْ جَوَارِيَّ، قَدْ حَمَلَتْ غَيْرَ مَرَّةٍ وَاَسْقَطَتْ، وَهِيَ الْاٰنَ حَامِلٌ، فَدُلَّنِيْ عَلٰى مَا تَتَعَالَجُ بِهٖ فَتَسْلَمُ. فَقَالَ: لَا تَخَفْ مِنْ اِسْقَاطِهَا، فَاِنَّهَا تَسْلَمُ وَتَلِدُ غُلَامًا اَشْبَهَ النَّاسِ بِاُمِّهٖ، وَيَكُوْنُ لَهٗ خِنْصِرٌ زَآئِدَةٌ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى لَيْسَتْ بِالْمُدَلَّاةِ، وَفِيْ رِجْلِهِ الْيُسْرٰى خِنْصِرٌ زَآئِدَةٌ لَيْسَتْ بِالْمُدَلَّاةِ. فَقُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ: اَشْهَدُ اَنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ فَوَلَدَتِ الزَّاهِرِيَّةُ غُلَامًا اَشْبَهَ النَّاسِ بِاُمِّهٖ، فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى خِنْصِرٌ زَآئِدَةٌ لَيْسَتْ بِالْمُدَلَّاةِ، وَفِيْ رِجْلِهِ الْيُسْرٰى خِنْصِرٌ زَآئِدَةٌ لَيْسَتْ بِالْمُدَلَّاةِ، عَلٰى مَا كَانَ وَصَفَهٗ لِيَ الرِّضَا. فَمَنْ يَلُوْمُنِيْ عَلٰى نَصْبِيْ اِيَّاهُ عَلَمًا؟!۔

عبداللہ بن محمد الہاشمی کا بیان ہے: میں ایک دن مامون کے دربار میں حاضر ہوا تو اس نے مجھے روک

---

[1] سورۂ جن، آیت ۲۶۔۲۷۔

[2] الخرائج والجرائح، ج ۱، ص ۳۴۳۔

لیا اور وہاں موجود سب افراد کو باہر نکال دیا۔ پھر کھانا منگوایا اور ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر خوشبو لگائی، پھر ایک پردہ ڈال دیا اور مجھے حکم دیا کہ صاحبِ طوس (امام رضاؑ) کا مرثیہ سناؤ۔ میں نے یہ شعر پڑھا:

"خدا سرزمین طوس پر اور اس کے ساکن پر رحمت نازل کرے جو عترت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرد تھے اور ہمیں رنج و غم دے کر رخصت ہو گئے"۔

مامون یہ سن کر رونے لگا اور مجھ سے کہا: عبداللہ! میرے اور تمہارے گھرانے والے مجھے ملامت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہد کیوں بنا دیا۔ سنو! میں تم سے ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ ایک دن میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے عرض کی: میں آپؑ پر قربان! آپؑ کے آباء و اجداد موسیٰ بن جعفر، جعفر بن محمد، محمد بن علی اور علی بن الحسین علیہم السلام کے پاس تمام گزشتہ اور آئندہ قیامت تک کا علم تھا اور آپؑ انہی کے وصی اور وارث ہیں اور آپؑ کے پاس انہی کا علم ہے۔ میری ایک مشکل حل فرما دیں۔ آپؑ نے فرمایا: بتاؤ! میں نے کہا: میری کنیز زاہریہ میرے لئے ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ میں اس پر کسی کنیز کو فوقیت نہیں دے سکتا۔ یہ متعدد بار حاملہ ہو چکی ہے اور ہر بار اس کا حمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اب پھر یہ حاملہ ہے۔ مجھے کوئی ایسا علاج بتائیں کہ اس دفعہ یہ حمل ضائع نہ ہو۔ آپؑ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں، اس مرتبہ اسقاط نہیں ہوگا اور ایسا بچہ پیدا ہوگا جو بالکل اپنی ماں کی شبیہ ہوگا اور اس کے داہنے ہاتھ اور داہنے پیر میں ایک انگلی زیادہ ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ بیشک خدا ہر شے پر قادر ہے۔ اس کے بعد زاہریہ کے یہاں بالکل ویسا ہی بچہ پیدا ہوا جیسا حضرتؑ نے فرمایا تھا۔ اب بتاؤ اس علم و فضل کے بعد کس کو حق ہے کہ ان کو پرچم ہدایت قرار دینے پر میری ملامت کر سکے۔[1]

۷۔ اموات و آفات کا علم:

[46] اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اِنَّآ اَهْلُ بَیْتٍ عُلِّمْنَا عِلْمَ الْمَنَایَا وَالْبَلَایَا وَالْاَنْسَابِ. وَاللّٰهِ! لَوْ اَنَّ رَجُلًا مِّنَّا قَامَ عَلٰی جِسْرٍ ثُمَّ عُرِضَتْ عَلَیْهِ هٰذِهِ الْاُمَّةُ لَحَدَّثَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ وَاَنْسَابِهِمْ۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: ہم اہلبیتؑ وہ ہیں جنہیں اموات، حوادثِ روزگار اور انساب کا علم

---

[1] عیون اخبار الرضاؑ، ج ۲، ص ۲۲۳، حدیث ۴۳۔ الغیبۃ، ص ۷۴، حدیث ۸۱۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۳۳۔

عطا کیا گیا ہے۔ ہم میں سے جس امام کو بھی کسی پل پر کھڑا کر دیا جائے اور ساری امت کو گزار دیا جائے تو وہ ہر ایک کے نام اور نسب کو بتا سکتا ہے۔[1]

[47] اَلْاِمَامُ زَيْنُ الْعَابِدِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: عِنْدَنَا عِلْمُ الْمَنَايَا وَالْبَلَايَا، وَفَصْلُ الْخِطَابِ، وَاَنْسَابُ الْعَرَبِ، وَمَوْلِدُ الْاِسْلَامِ۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ہمارے پاس جملہ اموات اور حوادث کا علم ہے، حرف آخر ہمارا ہے اور انساب عرب اور موالید اسلام سب ہمیں معلوم ہیں۔[2]

[48] اِسْحَاقُ بْنُ عَمَّارٍ: سَمِعْتُ الْعَبْدَ الصَّالِحَ يَنْعٰى اِلٰى رَجُلٍ نَفْسَهُ، فَقُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ: وَاِنَّهُ لَيَعْلَمُ مَتٰى يَمُوْتُ الرَّجُلُ مِنْ شِيْعَتِهٖ؟! فَالْتَفَتَ اِلَيَّ شِبْهَ الْمُغْضَبِ، فَقَالَ: يَا اِسْحَاقُ! قَدْ كَانَ رُشَيْدٌ الْهَجَرِيُّ يَعْلَمُ عِلْمَ الْمَنَايَا وَالْبَلَايَا، وَالْاِمَامُ اَوْلٰى بِعِلْمِ ذٰلِكَ. ثُمَّ قَالَ: يَا اِسْحَاقُ! اِصْنَعْ مَا اَنْتَ صَانِعٌ، فَاِنَّ عُمُرَكَ قَدْ فَنِيَ، وَاِنَّكَ تَمُوْتُ اِلٰى سَنَتَيْنِ، وَاِخْوَتُكَ وَاَهْلُ بَيْتِكَ لَا يَلْبَثُوْنَ بَعْدَكَ اِلَّا يَسِيْرًا حَتّٰى تَتَفَرَّقَ كَلِمَتُهُمْ، وَيَخُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَشْمَتَ بِهِمْ عَدُوُّهُمْ. فَكَانَ هٰذَا فِيْ نَفْسِكَ؟ فَقُلْتُ: فَاِنِّيْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ بِمَا عَرَضَ فِيْ صَدْرِيْ. فَلَمْ يَلْبَثْ اِسْحَاقُ بَعْدَ هٰذَا الْمَجْلِسِ اِلَّا يَسِيْرًا حَتّٰى مَاتَ. فَمَا اَتٰى عَلَيْهِمْ اِلَّا قَلِيْلٌ حَتّٰى قَامَ بَنُوْ عَمَّارٍ بِاَمْوَالِ النَّاسِ فَاَفْلَسُوْا۔

اسحاق بن عمار کا بیان ہے: میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اپنی موت کے بارے میں خبر دیتے ہوئے سنا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ کیا یہ اپنے شیعوں کی موت کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ آپؑ نے غضبناک انداز سے میری طرف دیکھا اور فرمایا: اسحاق! رشید ہجری کو اموات اور حوادث کا علم تھا تو امام تو اس سے کہیں زیادہ افضل ہوتا ہے۔ اسحاق! دیکھو جو کچھ کرنا ہے کر لو کہ تمہاری زندگی تمام ہو رہی ہے اور تم دو سال کے اندر مر جاؤ گے اور تمہارے برادران اور اہل خانہ بھی تمہارے بعد چند ہی دنوں میں آپس میں اختلاف کا شکار ہو جائیں گے اور ایک دوسرے سے خیانت کریں گے۔ یہاں تک کہ دشمن انہیں طعنے دیں گے۔ اسحاق! یہ سوچ تمہارے دل میں کیسے آ گئی؟ میں نے عرض کی: مولا! میں اپنے غلط

---

[1] بصائر الدرجات، ص ۲۶۸، حدیث ۱۲۔

[2] بصائر الدرجات، ص ۲۶۶، حدیث ۳۔ تفسیر فرات، ص ۳۹۶، حدیث ۵۲۷۔ الیقین، ص ۳۱۸، حدیث ۱۲۱۔

خیالات کے بارے میں مالک کی بارگاہ میں استغفار کرتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ ہی مدت بعد اسحاق کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بنی عمار کو لوگوں کے سامنے دست دراز کرنا پڑ گیا اور وہ بھوک و افلاس کا شکار ہو گئے۔[1]

[49] اَلْاِمَامُ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ. فِيْمَا كَتَبَ اِلٰى عَبْدِاللهِ بْنِ جُنْدَبٍ. : اَمَّا بَعْدُ. فَاِنَّ مُحَمَّدًا كَانَ اَمِيْنَ اللهِ فِيْ خَلْقِهٖ. فَلَمَّا قُبِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ كُنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَثَتَهٗ. فَنَحْنُ اُمَنَآءُ اللهِ فِيْ اَرْضِهٖ. عِنْدَنَا عِلْمُ الْمَنَايَا وَالْبَلَايَا. وَاَنْسَابُ الْعَرَبِ. وَمَوْلِدُ الْاِسْلَامِ۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے عبداللہ بن جندب کے نام خط میں لکھا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مخلوقات میں پروردگار کے امین تھے۔ اس کے بعد جب آپ کا وصال ہوگیا تو ہم اہلبیتؑ ان کے وارث ہیں۔ ہم زمین خدا پر اس کے اسرار کے امانتدار ہیں اور ہمارے پاس تمام اموات اور حوادث روزگار اور انساب عرب اور موالید اسلام کا علم موجود ہے۔[2]

۸۔ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اس کا علم:

[50] رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ: مَا يَنْقَلِبُ جَنَاحُ طَآئِرٍ فِي الْهَوَآءِ اِلَّا وَعِنْدَنَا فِيْهِ عِلْمٌ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فضا میں کوئی پرندہ پر نہیں مارتا ہے مگر ہمیں اس کا علم ہوتا ہے۔[3]

[51] اَبُوْ حَمْزَةَ: سَمِعْتُ اَبَا جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُوْلُ: لَا وَاللهِ! لَا يَكُوْنُ عَالِمٌ جَاهِلًا اَبَدًا. عَالِمًا بِشَيْءٍ جَاهِلًا بِشَيْءٍ. ثُمَّ قَالَ: اللهُ اَجَلُّ وَاَعَزُّ وَاَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَفْرِضَ طَاعَةَ عَبْدٍ يَحْجُبُ عَنْهُ عِلْمَ سَمَآئِهٖ وَاَرْضِهٖ. ثُمَّ قَالَ: لَا يَحْجُبُ ذٰلِكَ عَنْهُ۔

ابوحمزہ کا بیان ہے: میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا: حقیقی عالم جاہل نہیں ہوسکتا ہے کہ ایک شے کا عالم ہو اور ایک شے سے جاہل۔ پروردگار اس بات سے اجل وارفع ہے کہ وہ کسی بندہ کی اطاعت واجب کرے اور اسے آسمان و زمین کے علم سے محروم رکھے۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔[4]

---

[1] الکافی، ج ۱، ص ۴۸۴، حدیث ۷۔ بصائر الدرجات، ص ۲۶۵، حدیث ۱۳۔ الخرائج والجرائح، ج ۲، ص ۷۱۲، حدیث ۹۔

[2] تفسیر قمی، ج ۲، ص ۱۰۴۔ مختصر بصائر الدرجات، ص ۱۷۴۔ بصائر الدرجات، ص ۲۶۷، حدیث ۵۔

[3] عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۳۲، حدیث ۵۴۔ صحیفۃ الرضا، ص ۶۲، حدیث ۱۰۰۔

[4] الکافی، ج ۱، ص ۲۶۲، حدیث ۶۔

[52] اَلْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ اللهَ اَجَلُّ وَاَعْظَمُ مِنْ اَنْ يَحْتَجَّ بِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِهٖ ثُمَّ يُخْفِيَ عَنْهُ شَيْئًا مِّنْ اَخْبَارِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: پروردگار اس بات سے اجل واعلیٰ ہے کہ وہ کسی بندے کو دوسرے بندوں پر حجت قرار دے اور پھر آسمان وزمین کی خبروں کو اس پر پوشیدہ رکھے۔[1]

[53] عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اللهُ اَحْكَمُ وَاَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَّفْرِضَ طَاعَةَ عَبْدٍ يَحْجُبُ عَنْهُ خَبَرَ السَّمَآءِ صَبَاحًا وَّمَسَآءً۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: اللہ کی حکمت اور اس کے کرم کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ایسے بندہ کی اطاعت واجب قرار دے جس سے آسمان وزمین کے صبح وشام کے حالات کو پوشیدہ رکھا ہو۔[2]

۹۔حوادث روز وشب کا علم:

[54] سَلَمَةُ بْنُ مُحْرِزٍ: سَمِعْتُ اَبَا جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُوْلُ: اِنَّ مِنْ عِلْمِ مَا اُوْتِيْنَا تَفْسِيْرَ الْقُرْاٰنِ وَاَحْكَامَهٗ. وَعِلْمَ تَغْيِيْرِ الزَّمَانِ وَحَدَثَانِهٖ. اِذَا اَرَادَ اللهُ بِقَوْمٍ خَيْرًا اَسْمَعَهُمْ. وَلَوْ اَسْمَعَ مَنْ لَّمْ يَسْمَعْ لَوَلّٰى مُعْرِضًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْ. ثُمَّ اَمْسَكَ هُنَيْئَةً. ثُمَّ قَالَ: وَلَوْ وَجَدْنَا اَوْعِيَةً اَوْ مُسْتَرَاحًا لَقُلْنَا. وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ۔

سلمہ بن محرز کہتے ہیں: میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ہمارے علوم میں تفسیر قرآن واحکام قرآن، علم تغیرات وحوادث زمانہ سب شامل ہیں۔ پروردگار جب کسی قوم کیلئے خیر چاہتا ہے تو انہیں سنا دیتا ہے اور اگر کسی ایسے کو سنا دے جو سننا نہیں چاہتا ہے تو منہ پھیر لے گا جیسا کہ سنا ہی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر آپؑ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر فرمایا: اگر مناسب ظرف اور مطمئن ماحول مل جاتا تو میں اور کچھ بیان کرتا لیکن فی الحال اللہ ہی سے طلب امداد کر رہا ہوں۔[3]

[55] ضُرَيْسٌ: كُنْتُ اَنَا وَاَبُوْ بَصِيْرٍ عِنْدَ اَبِيْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْ بَصِيْرٍ: بِمَ يَعْلَمُ عَالِمُكُمْ؟ قَالَ: اِنَّ عَالِمَنَا لَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ. وَلَوْ وَكَلَهُ اللهُ اِلٰى نَفْسِهٖ لَكَانَ كَبَعْضِكُمْ.

---

[1] بصائر الدرجات، ص ۱۲۶، حدیث ۶۔

[2] بصائر الدرجات، ص ۱۲۵، حدیث ۵۔

[3] الکافی، ج ۱، ص ۲۲۹، حدیث ۳۔ بصائر الدرجات، ص ۱۹۴، حدیث ۱۔

وَلٰكِنْ يُحَدَّثُ فِي السَّاعَةِ بِمَا يَحْدُثُ بِاللَّيْلِ. وَفِي السَّاعَةِ بِمَا يَحْدُثُ بِالنَّهَارِ. الْاَمْرِ بَعْدَ الْاَمْرِ. وَالشَّيْءِ بَعْدَ الشَّيْءِ بِمَا يَكُوْنُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔

ضریس روایت کرتے ہیں: میں اور ابوبصیر امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ابوبصیر نے آپؑ سے علم اہلبیتؑ کے بارے میں سوال کیا جس پر آپؑ نے فرمایا: ہمیں صرف خاص غیب کا علم نہیں ہے اور اگر خدا ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا تو ہم تمہارے ہی جیسا ہوتے، لیکن ہمیں دن کو رات کی باتیں بتادی جاتی ہیں اور رات کو دن کے امور سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور یونہی قیامت تک کے حالات سے باخبر کر دیا جاتا ہے۔[1]

[56] حُمْرَانُ بْنُ اَعْيَنَ: قُلْتُ لِاَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: عِنْدَكُمُ التَّوْرَاةُ وَالْاِنْجِيْلُ وَالزَّبُوْرُ وَمَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى؟ قَالَ: نَعَمْ. قُلْتُ: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْعِلْمُ الْاَكْبَرُ! قَالَ: يَا حُمْرَانُ! لَوْ لَمْ يَكُنْ غَيْرُ مَا كَانَ. وَلٰكِنْ مَا يُحْدِثُ اللّٰهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ عِلْمُهُ عِنْدَنَا اَعْظَمُ۔

حمران بن اعین کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: کیا آپؑ کے پاس توریت، انجیل، زبور، صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ کا بھی علم ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: بیشک! میں نے عرض کی: یہ تو بہت بڑا علم ہے! فرمایا: حمران! ہاں، اگر یہ یہیں تک محدود ہوتا۔ مگر ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر شب و روز میں پیدا ہونے والے جملہ حوادث کا علم بھی ہے۔[2]

[57] مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلِمٍ: قُلْتُ لِاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: كَلَامٌ قَدْ سَمِعْتُهُ مِنْ اَبِي الْخَطَّابِ، فَقَالَ: اِعْرِضْهُ عَلَيَّ. فَقُلْتُ: يَقُوْلُ: اِنَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ الْحَلَالَ وَالْحَرَامَ وَفَصْلَ مَا بَيْنَ النَّاسِ، فَسَكَتَ. فَلَمَّا اَرَدْتُ الْقِيَامَ اَخَذَ بِيَدِيْ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: يَا مُحَمَّدُ! كَذَا عِلْمُ الْقُرْاٰنِ وَالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ يَسِيْرٌ فِيْ جَنْبِ الْعِلْمِ الَّذِيْ يَحْدُثُ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔

محمد بن مسلم کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: مولا! میں نے ابوالخطاب کی زبانی ایک بات سنی ہے؟ فرمایا: وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی: اس کا کہنا ہے کہ آپؑ حضرات

---

[1] مختصر بصائر الدرجات، ص ۱۱۳۔ الخرائج والجرائح، ج ۲، ص ۸۳۱، حدیث ۴۷۔ بصائر الدرجات، ص ۳۲۵، حدیث ۲۔

[2] بصائر الدرجات، ص ۱۴۰، حدیث ۵۔

حلال وحرام اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کا علم رکھتے ہیں۔ آپؑ خاموش ہو گئے۔ پھر جب میں نے چلنے کا ارادہ کیا تو آپؑ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: دیکھو، محمد! علم قرآن اور علم حلال وحرام سے بڑھ کر ہمارے پاس حوادث روز وشب کا علم بھی ہے۔[1]

[58] اَلْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا مِنْ لَيْلَةٍ تَأْتِيْ عَلَيْنَا اِلَّا وَاَخْبَارُ كُلِّ اَرْضٍ عِنْدَنَا. وَمَا يَحْدُثُ فِيْهَا. وَاَخْبَارُ الْجِنِّ. وَاَخْبَارُ اَهْلِ الْهَوٰى مِنَ الْمَلٰئِكَةِ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ہمارے یہاں کوئی رات ایسی نہیں آتی ہے جب ساری کائنات کا اور اس کے حوادث کا علم ہمیں نہ ہوتا ہو۔ ہمارے پاس جنات کا بھی علم ہے اور ملائکہ کی خواہشات کا بھی علم ہے۔[2]

(جاری ہے)

*****

قائم آل محمد علیہم السلام کی پہچان

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اِنَّ الْقَآئِمَ مِنَّا هُوَ الْمَهْدِيُّ الَّذِيْ يَجِبُ اَنْ يُّنْتَظَرَ فِيْ غَيْبَتِهٖ وَ يُطَاعَ فِيْ ظُهُوْرِهٖ وَ هُوَ الثَّالِثُ مِنْ وُلْدِيْ۔

بے شک ہمارے ''قائم'' ہی مہدیؑ ہیں، جن کی غیبت کے زمانہ میں اُن کا انتظار واجب ہے اور ظہور کے بعد ان کی اطاعت فرض ہے۔ وہ میری اولاد سے تیسرے ہوں گے۔ (یعنی امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے بعد تیسرے نمبر پر ہوں گے)۔

(کمال الدین، ج ۲، ص ۳۷۷)

---

[1] بصائر الدرجات، ص ۳۹۴، حدیث ۱۱۔ الاختصاص، ص ۳۱۴۔

[2] کامل الزیارات، ص ۳۲۸۔

قسط:20

شرحِ چہل حدیث

آیت اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ

تیرہویں حدیث:

بِالسَّنَدِ الْمُتَّصِلِ اِلَى الشَّيْخِ الْجَلِيْلِ ثِقَةِ الْاِسْلَامِ مُحَمَّدِ بْنِ يَعْقُوْبَ عَنْ عِدَّةٍ مِّنْ اَصْحَابِنَا، عَنْ اَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدٍ، عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَسْبَاطٍ، عَنْ اَحْمَدَ بْنِ عُمَرَ الْحَلَّالِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ سُوَيْدٍ، عَنْ اَبِي الْحَسَنِ الْاَوَّلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: سَئَلْتُهُ عَنْ قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝﴾[1] فَقَالَ: اَلتَّوَكُّلُ عَلَى اللهِ دَرَجَاتٌ: مِنْهَا اَنْ تَتَوَكَّلَ عَلَى اللهِ فِيْ اُمُوْرِكَ كُلِّهَا، فَمَا فَعَلَ بِكَ كُنْتَ عَنْهُ رَاضِيًا، تَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا يَاْلُوْكَ خَيْرًا وَّفَضْلًا وَّتَعْلَمُ اَنَّ الْحُكْمَ فِيْ ذٰلِكَ لَهٗ، فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ بِتَفْوِيْضِ ذٰلِكَ اِلَيْهِ وَثِقْ بِهٖ فِيْهَا وَفِيْ غَيْرِهَا۔

علی بن سوید کہتے ہیں: میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے آیہ مجیدہ: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝﴾ کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

خدا پر بھروسہ کرنے کے درجات ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اپنے تمام کاموں میں خدا پر بھروسہ کرو، اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے اس پر خوش رہو اور یہ جان لو کہ تم سے وہ اپنے فضل و نیکی کو نہیں روکے گا اور یہ جان لو کہ تمام امور کا مالک وہی ہے۔ پس (تمام امور کو) اس کے سپرد کر کے اس پر بھروسہ کرو، اس امر اور دیگر امور میں خدا پر اعتماد رکھو"۔[2]

---

[1] سورۂ طلاق، آیت ۳۔ ترجمہ: "اور جو شخص اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ اس کیلئے کافی ہے"۔

[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۶۵، کتاب ایمان و کفر، باب التفویض الی اللہ والتوکل علیہ، حدیث ۵۔

شرح:

''حلّال''، ''تل'' تیل بیچنے والے کو کہتے ہیں۔

''ابوالحسن (یا) ابوالحسن اوّل'' سے مراد حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام، ''ابوالحسن ثانی'' سے حضرت امام رضا علیہ السلام اور ''ابوالحسن ثالث'' سے حضرت امام علی نقی علیہ السلام مراد لئے جاتے ہیں۔

لغوی لحاظ سے ''توکل'' کا معنی ''اظہار عاجزی و دوسرے پر اعتماد'' ہے۔ عربی جملے ''اِتَّکَلْتُ عَلٰی فُلَانٍ فِیْ اَمْرِیْ'' (میں نے اپنے کام میں فلاں پر بھروسہ کیا) کا مطلب ''اِعْتَمَدْتُہٗ'' (میں نے اس پر اعتماد کیا) ہے۔

''حَسْبُہٗ'' کا مطلب ''مُحْسِبُہٗ وَ کَافِیْہِ'' ہے یعنی اس کیلئے کافی ہے۔

''یَاْلُوْکَ'' دراصل ''اَلَا. یَاْلُوْا. اَلْوًا'' سے ہے جس کے معنی تقصیر کے ہیں۔ البتہ بعض علما نے کہا ہے: ''جب یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے تو منع کے معنی کیلئے ہوتا ہے''[1]۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس سے معنی سلیس ہو جاتے ہیں، لیکن یہ لازمی نہیں ہے، بلکہ تقصیر کے معنی ہی درست ہیں۔ جیسا کہ صحاح سے بھی اس کے خلاف کا استفادہ ہوتا ہے۔ صاحب صحاح کہتے ہیں: ''اَلَا یَاْلُوْ، اَیْ قَصَّرَ. وَ فُلَانٌ لَا یَاْلُوْکَ نُصْحًا''۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر بھی یہ اسی معنی میں آتا ہے۔

''توکل'' کا مطلب ''تفویض'' کے علاوہ ہے۔ ''توکل'' اور ''تفویض'' دونوں ''رضا'' اور ''وثوق'' کے متضاد ہیں۔ ہم اس بارے میں آگے چل کر تفصیل بیان کریں گے۔

اس حدیث کی ضروری تفصیلات کو ہم چند فصلوں میں بیان کریں گے:

پہلی فصل: توکل اور اس کے درجات کا بیان

مختلف مسلکوں کے اعتبار سے توکل کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں جو معانی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چنانچہ صاحب ''منازل السائرین'' فرماتے ہیں:

اَلتَّوَکُّلُ کِلَۃُ الْاَمْرِ کُلِّہٖ اِلٰی مَالِکِہٖ۔

---

[1] مراۃ العقول، ج ۸، ص ۲۳، کتاب ایمان و کفر، باب التفویض، حدیث ۵۔

توکل کا مطلب تمام امور کو ان کے مالک کے حوالہ کر دینا اور اس کی وکالت پر بھروسہ کرنا ہے۔[1]

بعض عرفاء نے کہا ہے:

اَلتَّوَکُّلُ طَرْحُ الْبَدَنِ فِی الْعُبُوْدِیَّۃِ وَ تَعَلُّقُ الْقَلْبِ بِالرُّبُوْبِیَّۃِ۔

توکل کا مطلب بدن کو بندگی میں ڈال دینا اور قلب کا ربوبیت سے تعلق پیدا کرلینا ہے۔[2]

بعض لوگوں نے کہا ہے:

اَلتَّوَکُّلُ عَلَی اللّٰہِ اِنْقِطَاعُ الْعَبْدِ فِیْ جَمِیْعِ مَایَاْمُلُہٗ مِنَ الْمَخْلُوْقِیْنَ۔

توکل برخدا کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی تمام امیدوں کو مخلوق خدا سے قطع کر لے۔[3]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ تمام معانی آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں اور کسی مفہوم کے بارے میں بحث کرنا ضروری نہیں اور جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بندوں کے اختلاف مقام کی وجہ سے ان کے درجے بھی مختلف ہوں گے اور چونکہ توکل کے درجات کا علم بندوں کی معرفت پروردگار جل جلالہ کے درجات علم پر موقوف ہے، اس لئے ہم اس کے ذکر کرنے پر مجبور ہیں۔

پس آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اصول معارف میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ربوبیت اور مالکیت کا علم حق ہے اور کیفیت تصرف تمام امور کے اندر یہ بھی ذات مقدس کا حق ہے۔ اس بات کو تسلیم کئے بغیر سالکین کے مقامات حاصل نہیں ہو سکتے اور ہم اس بحث میں علمی انداز سے داخل نہیں ہوں گے، کیونکہ علمی انداز سے اس بحث کا چھیڑنا جبر وتفویض کی تحقیق پر موقوف ہے اور یہ بات اس کتاب کے مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا صرف لوگوں کے درجات معرفت کیا ہیں؟ اس کو بیان کریں گے۔

---

[1] منازل السائرین، ص ۳۳، قسم معاملات، باب ۲۷۔

[2] یہ کلام ابوتراب بخشی سے نقل ہوا ہے۔ (رسالہ قشیریہ، ج ۱، ص ۴۶۸)

[3] مجمع البحرین، ج ۴، ص ۵۴۶۔

ذات مقدس پروردگار عالم کے بارے میں لوگوں کی معرفت بہت ہی مختلف اور متفاوت ہے۔ عام موحد خدا کو مبادی اوامر اور کلیات جواہر وعناصر اشیاء کا خالق جانتے اور اس کے تصرف کو محدود سمجھتے ہیں اور احاطہ ربوبیت کے قائل نہیں ہیں۔ یہ لوگ زبان سے کبھی تو کہتے ہیں: ''مقدرات الٰہی حق ہے اور ہر چیز اسی کے تحت تصرف ہے، کوئی بھی موجود اس کے مقدس ارادے کے بغیر موجود نہیں ہوسکتا''، لیکن وہ لوگ اس مقام کے اہل نہیں ہیں، نہ از روئے علم وایمان اور نہ ہی شہود وجدان!

اس قسم کے لوگ جن میں ہم بھی شامل ہیں حق تعالیٰ کی ربوبیت کا علم نہیں رکھتے۔ ان کی توحید، ناقص ہے اور ظاہری اسباب وعلل کی بنا پر ربوبیت اور سلطنت حق سے محجوب ہیں اور مقام توکل پر فائز نہیں ہیں جس کے بارے میں اس وقت بات ہورہی ہے۔ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اسی لئے دنیاوی امور میں کسی بھی اعتبار سے حق پر بھروسہ نہیں کرتے اور سوائے اسباب ظاہری اور موثرات دنیاوی کے علاوہ کسی چیز سے ارتباط پیدا نہیں کرتے اور اگر کسی طرح کبھی خدا کی طرف توجہ کر بھی لیتے ہیں اور اس سے کوئی مقصد طلب کرتے ہیں تو یہ از روئے تقلید ہوتی ہے یا از روئے احتیاط، کیونکہ اس میں ان کو کوئی ضرر نہیں دکھائی دیتا اور نفع کا احتمال رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان میں توکل کی بو ہوتی ہے، لیکن اگر اسباب ظاہرہ کو اپنے موافق دیکھیں تو پھر خدا اور اسکے اختیارات سے بالکل غافل ہوجاتے ہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ توکل کسب وعمل کے منافی نہیں تو یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، بلکہ دلیل کے مطابق اور نقل کے موافق ہے، لیکن ربوبیت اور اسکے اختیارات سے حجاب اور اسباب کو مستقل شمار کرنا توکل کے منافی ہے۔ اس قسم کے لوگ جو اپنے دنیاوی کاموں میں کسی قسم کا توکل اور بھروسہ نہیں رکھتے، آخرت کے معاملے میں توکل کے بارے میں بڑی ڈینگ مارتے ہیں۔ ہر علم ومعرفت یا تہذیب نفس اور عبادت واطاعت کے بارے میں اگر تحقیر، کاہلی اور سستی کرتے ہیں تو فوراً خدا کے فضل وکرم پر اعتماد اور توکل کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر کسی زحمت وعمل کے صرف ''خدا بہت بڑا ہے اور ہم خدا کے فضل پر بھروسہ کرتے ہیں'' جیسے جملے کہہ دینے سے آخرت کے درجات حاصل کرلیں۔ دنیاوی امور کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ''سعی وعمل کرنا، اعتماد اور فضل وتوکل بر خدا کے منافی نہیں ہے''! یہ سب نفس وشیطان کی

مکاری ہے، کیونکہ یہ سب نہ دنیاوی اور نہ اخروی امور میں توکل کرتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی چیز کے بارے میں خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پس چونکہ دنیاوی امور کو اہمیت دیتے ہیں، اس لئے اسباب کا سہارا لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ اور اسکے اختیارات پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس کے برعکس آخرت کے کاموں کو چونکہ اہمیت نہیں دیتے اور یوم معاد اور اس کی تفصیل پر حقیقی ایمان نہیں رکھتے، اس لئے بہانے بناتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں: ''خدا بڑا ہے اور ہم اس پر بھروسہ کرتے ہیں'' اور کبھی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا سہارا لیتے ہیں، حالانکہ یہ تمام چیزیں زبانی جمع خرچ اور بے مفہوم باتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو دلیل یا نقل کے ذریعے سے عقیدہ رکھتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں کہ خدا مقدّرِ امور اور مسبّبِ اسباب ہے اور دنیائے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی قدرت اور اس کا تصرف غیر محدود ہے۔ یہ لوگ عقلی اعتبار سے خدا پر توکل رکھتے ہیں۔ یعنی عقلا و نقلا توکل کے ارکان ان کے یہاں مکمل ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ اپنے کو متوکل سمجھتے ہیں اور توکل کے لازم ہونے پر دلیل بھی قائم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے توکل کے ارکان کو ثابت کیا ہے ارکان توکل یہ ہیں:

۱۔ خداوند تعالیٰ بندوں کی ضرورتوں کو جانتا ہے۔

۲۔ خدا ان کی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر ہے۔

۳۔ اس کی ذات مقدس میں بخل نہیں ہے۔

۴۔ وہ اپنے بندوں پر رحمت و شفقت رکھتا ہے۔

پس اس کا لازمہ ہے کہ ایسے خدا پر بھروسہ کیا جائے جو عالم و قادر، غیر بخیل اور بندوں پر رحیم ہے، کیونکہ وہ ان کے فائدوں پر نگاہ رکھتا ہے اور کسی بھی مفاد کو نقصان پہنچنے نہیں دیتا، اگرچہ خود بندے مصلحت اور مفسدہ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ گروہ اگرچہ از روئے علم متوکل ہے، لیکن اس کے افراد ایمان کے مرتبے پر نہیں پہنچے ہیں، اسی لحاظ سے امور میں متزلزل ہیں اور ان کی عقل اور دل میں کش مکش ہے اور عقل مغلوب ہے، کیونکہ اس گروہ کے دل تو اسباب سے متعلق ہوتے ہیں اور تصرف حق سے محجوب ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو تصرف حق کو مخلوقات کے اندر دلوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کے دل اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ مقدّر امور حق تعالیٰ ہے اور وہی مالک اشیاء اور بادشاہ ہے۔ ان لوگوں نے

قلم عقل سے اپنے دلوں کی تختیوں پر ارکان توکل کو لکھ لیا ہے۔ یہ گروہ مقام توکل کا مالک ہے، لیکن مراتب اور درجات ایمان کے سلسلے میں اس گروہ کے اندر بھی بہت اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ یہ اطمینان وکمال کے درجے تک پہنچ جائے اور جب ایسا ہوجائے تبھی دلوں میں توکل کا کامل درجہ ظاہر ہوتا ہے اور اسباب کے ساتھ تعلق ودل بستگی نہیں پیدا ہوتی ہے اور ان لوگوں کے دل مقام ربوبیت تک شرفیاب ہوجاتے ہیں اور اس پر اطمینان واعتماد پیدا کر لیتے ہیں، جیسا کہ اس عارف نے توکل کی تعریف میں کہا ہے: ''بدن کو راہ عبودیت میں ڈال دینا اور قلب کو ربوبیت سے متعلق کر دینا توکل ہے''۔ یہ تمام چیزیں جو ذکر کی گئیں یہ اس صورت میں ہیں کہ قلب کثرت افعالی کے مقام میں واقع ہو، ورنہ وہ مقام توکل سے گزر جائے گا اور مقصود سے خارج ہوجائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ توکل کے درجات ہیں اور شاید حدیث میں جس درجے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد دوسرے گروہ کا توکل ہے، کیونکہ علم کو اس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے درجات کی طرف اشارہ ہو جو دوسرے اعتبار سے ہے، کیونکہ دوسری تقسیم کی بنا پر توکل کے دوسرے درجات بھی ہیں اور وہ اس طرح کے ہیں کہ جس طرح اصحابِ عرفان و ریاضت کے درجات ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے وحدت کی طرف تھوڑا تھوڑا کر کے پہنچتے ہیں۔ فنائے افعالی دفعتاً نہیں ہوا کرتی تدریجاً ہوا کرتی ہے۔ پہلے تو اپنے مقام پر ہوتی ہے اس کے بعد دیگر مخلوقات میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ توکل، رضا و تسلیم اور دیگر مقامات بھی آہستہ آہستہ حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے پہلے تو تھوڑے سے امور میں اور غائب ومخفی اسباب میں توکل کرے، اس کے بعد تھوڑا تھوڑا کر کے مقام مطلق تک پہنچ ئے۔ چاہے اسباب ظاہر وجلی ہوں یا باطنی وخفی اور چاہے اپنے کاموں میں ہو یا اعزا واقربا اور دوست احباب کے کاموں میں ہو۔ اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ''تم اپنے تمام امور میں توکل کرو''۔

دوسری فصل: توکل اور رضا کا فرق

یہ جان لو کہ مقام رضا توکل کے علاوہ ہے، بلکہ رضا کا مرتبہ ارفع واعلیٰ ہے، کیونکہ متوکل صرف اپنے مفاد اور بھلائی کا طالب ہوتا ہے اور خداوند عالم کو فاعل خیر سمجھتے ہوئے اپنے فلاح وبہبود کے حصول کیلئے

وکیل بناتا ہے، لیکن جو شخص مقام رضا پر فائز ہوتا ہے وہ اپنے ارادہ کو ارادۂ حق میں فنا کر دیتا ہے، اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، جیسا کہ بعض اہل سلوک سے لوگوں نے پوچھا کہ: مَاتُرِیْدُ؟ ''کیا چاہتے ہو؟'' فَقَالَ: اُرِیْدُ اَنْ لَّا اُرِیْدُ: تو انہوں نے جواب دیا: ''میں چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں''[ط]۔ اس کا مطلب مقامِ رضا تھا۔

اور جو حدیث شریف میں آیا ہے: فَمَا فَعَلَ بِكَ كُنْتَ عَنْهُ رَاضِيًا: ''جو کچھ تمہارے ساتھ خدا کرے تم اس پر راضی رہو'' اس کا مقصد مقام رضا نہیں ہے۔ اس لئے کہ آخر میں فرمایا ہے: ''یہ جان لو کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے اسی میں تمہارے لئے خیر و فضل ہے''۔ گویا کہ معصومؑ نے چاہا ہے کہ سامع کے ذہن میں مقام توکل کو ایجاد فرمائیں، اسی لئے آپؑ نے اس کیلئے چند تمہیدات ترتیب دی ہیں: فرمایا: تَعْلَمُ اَنَّهُ لَا يَاْلُوْكَ خَيْرًا وَّفَضْلًا: ''تم جانتے ہو کہ خدا تمہارے بارے میں کسی خیر و فضل کے سلسلے میں کمی نہیں کرے گا'' اس کے بعد فرمایا: وَتَعْلَمُ اَنَّ الْحُكْمَ فِيْ ذٰلِكَ لَهُ: ''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہے اسی کا حکم ہے''۔ ظاہری بات ہے کہ جس شخص کو یقین ہے کہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے اور اس سے کسی خیر و فضل کو کم نہیں کرے گا، اس کیلئے مقام توکل حاصل ہوتا ہے، کیونکہ توکل کے دو بڑے رکن وہی ہیں جن کو معصومؑ نے ذکر فرما دیا۔ اب رہے دو یا تین دوسرے ارکان تو ان کے واضح ہونے کی بنا پر ان کا ذکر نہیں کیا۔ پس ان مذکورہ تمہیدات اور غیر مذکورہ تمہیدات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے وہ موجب خوشنودی و رضا ہے۔ اس لئے کہ خیر و صلاح اسی میں ہے۔ پس اس طرح مقام توکل حاصل ہوتا ہے اور اسی لئے معصومؑ نے اس پر وضاحت کی ہے: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ، یعنی خدا پر توکل کرو۔

تیسری فصل: تفویض و توکل اور ثقہ میں فرق

تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ''تفویض'' اور ''توکل'' میں فرق ہے، جیسا کہ ثقہ، تفویض و توکل کے علاوہ ہے۔ اسی لئے سالکین کے مقامات میں ان کو ایک دوسرے سے الگ شمار کیا جاتا ہے۔

خواجہؒ فرماتے ہیں:

[ط] یہ کلام بایزید سے منقول ہے۔ (شرح منازل السائرین، ص ۹، قسم چہارم در اخلاق، باب رضا)

اَلتَّفْوِیْضُ اَلْطَفُ اِشَارَۃً وَ اَوْسَعُ مَعْنًی مِنَ التَّوَکُّلِ۔ ثُمَّ قَالَ: اَلتَّوَکُّلُ شُعْبَۃٌ مِنْہُ۔

تفویض، توکل سے زیادہ لطیف و باریک ہے۔ پھر فرمایا: توکل اس کا ایک شعبہ ہے۔

اس لئے کہ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر کسی توانائی وقوت کو نہ دیکھے، بلکہ تمام امور میں اپنے کو بے اختیار اور حق تعالیٰ کو با اختیار سمجھے، لیکن توکل ایسا نہیں ہے، کیونکہ متوکل اختیارات، بھلائی اور مفادات حاصل کرنے کیلئے خداوند عالم کو اپنا قائم مقام کرتا ہے۔ پس تفویض زیادہ وسیع ہے اور توکل اسی کا ایک شعبہ ہے، کیونکہ توکل کا تعلق صرف مفادات میں ہوتا ہے اور تفویض کا تعلق مطلق امور میں ہوتا ہے۔ نیز توکل، توکل کا باعث بننے والے سبب کے واقع ہونے کے بعد واقع ہوتا ہے، یعنی وہ امر کہ جس میں بندہ خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ مثلاً پیغمبرؐ اور اصحاب پیغمبرؐ کا خدا پر بھروسہ کرنا، مشرکین سے حفاظت کے وقت، اس وقت کہ جب ان سے یہ بات کہی گئی کہ: ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾[1]: ''تحقیق بعض لوگوں نے تمہارے لئے عظیم لشکر جمع کر لیا ہے، لہٰذا ان سے ڈرو تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے خدا ہی کافی ہے، وہی ہمارا ذمہ دار ہے''، لیکن تفویض وقوع سبب سے پہلے ہوا کرتی ہے، جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی دُعا ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ[2]: ''خدایا میں نے اپنے نفس کو تیرے حوالے کیا اور تجھ پر اعتماد کیا اور اپنے معاملے کو تیرے سپرد کر دیا''۔ البتہ کبھی وقوع سبب کے بعد بھی تفویض ہوتی ہے، جیسے مومن آل فرعون کی تفویض!

(مؤلف کہتے ہیں:) میں نے جو کچھ بھی ذکر کیا یہ مشہور عارف عبدالرزاق کاشانیؒ[3] کی شرح کا

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۳۔

[2] الکافی، ج ۲، ص ۵۵۹۔

[3] ملا عبدالرزاق بن جمال (جلال) الدین اسحاق کاشانی سمرقندی جن کی کنیت ''ابو الغنائم'' اور لقب ''کمال الدین'' ہے، آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عارفوں اور فصوص الحکم کے بڑے شارحین میں سے ہیں۔ ان کا انتقال ۷۳۰ یا ۷۳۵ ہجری میں ہوا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں: اصطلاحات الصوفیہ، تاویل الآیات یا تاویلات القرآن، شرح فصوص الحکم۔

ماحصل ہے جو جناب عارف کامل خواجہ عبداللہ کے کلام[1] سے تھوڑا سا مختلف اور ذرا مختصر ہے۔ ویسے خواجہ کا کلام بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

البتہ توکل کا تفویض کا ایک حصہ ہونا ذرا قابل غور طلب مطلب ہے اور تفویض کو توکل سے عام شمار کرنا واضح قسم کا مسامحہ ہے، نیز اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ توکل صرف وقوع سبب کے بعد واقع ہوتی ہے، بلکہ دونوں جگہوں پر توکل ہوتی ہے اور حدیث میں جو یہ آیا ہے: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ بِتَفْوِيضِ ذٰلِكَ اِلَيْهِ تو شاید اس کا یہ معنی ہو کہ توکل اپنا دائرہ اختیار دیکھے بغیر عمل میں نہیں آتی، الہٰذا جو چیز اپنے سے متعلق ہو اس میں دوسرے کو وکیل بنا دینا اور اس کے سپرد کر دینا توکل کہلائے گا۔ پس حضرتؑ یہ چاہتے ہیں کہ اس کو مقام توکل سے ترقی دے کر مقام تفویض تک پہنچا دیں اور بندے کو یہ سمجھا دیں کہ خدا تصرف میں تیرا قائم مقام نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنے ملک پر متصرف اور اپنی مملکت کا مالک ہے۔ خود خواجہؒ نے بھی منازل السائرین میں توکل کے تیسرے درجے میں اس مطلب کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اسی طرح ''ثقہ'' توکل وتفویض دونوں کے علاوہ ہے جیسا کہ خواجہؒ نے فرمایا:

اَلثِّقَةُ سَوَادُ عَيْنِ التَّوَكُّلِ وَ نُقْطَةُ دَائِرَةِ التَّفْوِيْضِ، وَ سُوَيْدَاءُ قَلْبِ التَّسْلِيْمِ۔

ثقہ چشم توکل کی سیاہی، دائرہ تفویض کا نقطہ اور قلب تسلیم کا مرکز ہے۔[2]

یعنی اس کے بغیر مقامات ثلاثہ حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ ان مقامات کی روح، خدا پر اعتماد اور ثقہ ہے اور جب تک بندہ خدا پر وثوق نہ رکھے گا ان مقامات کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اب پتہ چلا کہ حضرتؑ نے توکل وتفویض کے بعد کیوں فرمایا: وَثِقْ بِهٖ فِيْهَا وَفِيْ غَيْرِهَا یعنی تمام امور میں خدا پر بھروسہ رکھو۔

(اختتام حدیث سیزدہم)

(جاری ہے)

✲✲✲✲✲

---

[1] شرح منازل السائرین، ص ۷۸، باب معاملات، باب تفویض۔

[2] منازل السائرین، ص ۳۵، قسم البدایات، باب ثقہ۔

مدحِ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

از: علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ

خلاق دو عالم کا ایسا شہ کار امام صادقؑ ہیں
سرکار رسالتؐ کا زندہ کردار امام صادقؑ ہیں

اسلام کے ہر منصب کیلئے اقرار امام صادقؑ ہیں
اور کفر کے ہر مذہب کیلئے انکار امام صادقؑ ہیں

قدرت نے عطا کی ہے ان کو پروازِ نظر کی وہ طاقت
مذہب کی ہر اک خدمت کے لئے تیار امام صادقؑ ہیں

گر دین خدا پر حملہ ہو بن جاتے ہیں یہ مذہب کی سپر
باطل جو اُٹھائے سر اپنا تلوار امام صادقؑ ہیں

سب اہل ستم ان سے بھاگے ٹھہرا نہ کوئی ان کے آگے
فرار ہیں سارے اہل ستم کرار امام صادقؑ ہیں

منصور کا ناصر کوئی نہیں اس رہ کا مسافر کوئی نہیں
اب قافلۂ حق کے تنہا سالار امام صادقؑ ہیں

جو دین خدا کا ہو جویا اس کے لئے ہیں قرآں گویا
دشمن کے لئے اک فولادی دیوار امام صادقؑ ہیں

ایمان کی ہر حکمت اُن سے اسلام کی ہر وسعت اُن سے
ہے علم اگر اک نقطہ با پرکار امام صادقؑ ہیں

جو امتِ حق میں شامل ہو جو جنتِ حق میں داخل ہو
لازم ہے اُسے یہ یاد رہے سردار امام صادقؑ ہیں

مالک سے اگر تصدیق نہیں پھر کوئی بشر صدیق نہیں
اور دہر کی ہر سچائی کا معیار امام صادقؑ ہیں

✲✲✲✲✲

فتنوں میں پناہ

حضرت رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

سَيَكُوْنُ مِنْ بَعْدِیْ فِتْنَةٌ. فَإِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَالْزَمُوْا عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ. فَإِنَّهُ الْفَارُوْقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ۔

عنقریب میرے بعد فتنہ پیدا ہوگا۔ جب ایسی صورت حال پیدا ہو تو تم تم علی علیہ السلام کا دامن تھام لینا، علی علیہ السلام ہی حق اور باطل میں کے درمیان حدِ فاصل ہیں۔

(بحار الانوار، ج ۳۸، ص ۳۲)